مُرتّبہ

پروفیسر مغنی تبسّم

ادارۂ ادبیاتِ اُردو - حیدرآباد

(م)
غ

نگارشاتِ زورؔ

مرتبہ

پروفیسر مغنی تبسم

ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد (۳۳۰)

اشاعت اول: مئی ۱۹۸۹ء

تعداد: ایک ہزار

کتابت: جناب عبدالکریم خوش نویس
جناب محمد غالب خوش نویس

طباعت: اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار۔ حیدرآباد

قیمت: پندرہ روپے

پبلشر: ادارۂ ادبیات اردو (پنجہ گٹہ) حیدرآباد
آندھرا پردیش

ملنے کا پتہ: ادارۂ ادبیات اردو
ایوان اردو
پنجہ گٹہ روڈ۔ حیدرآباد۔ ۵۰۰۴۸۲

فون نمبر: ۳۸۴۶۹

مشمولات

ابتدائیہ

نگارشاتِ زورؔ ، ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ مرحوم کے منتخب مضامین کا مجموعہ ہے جسے ادارۂ ادبیاتِ اردو کی جانب سے شائع کیا جارہا ہے ۔

ڈاکٹر زورؔ کی پہلودار شخصیت کے متعلق ان کے قریبی رفیق کار اور دہلوی شاگرد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے صحیح لکھا ہے کہ " موجودہ دور میں اردو والوں کے نزدیک دکنی کے بغیر زورؔ اور زورؔ کے بغیر دکنی دونوں ادھوری سچائیاں ہیں اردو ان کا اوڑھنا بچھونا تھی ان کی ایک ایک سانس اردو کے لیے وقف تھی اور انھوں نے اپنی پوری زندگی اسی کی خدمت میں گزار دی " ڈاکٹر زور کی تصانیف کی تعداد کسی طرح پچاس سے کم نہیں ۔ ان میں ادبی شہ پارے ، روح تنقید ، ہندوستانی لسانیات ، سیرِ گولکنڈہ ، اردو کے اسالیبِ بیان ، کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ اور دکنی ادب کی تاریخ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں ۔

ڈاکٹر زور ادارہ کے بانی معتمد تھے جن کی سعیِ محکم اور عملِ پیہم کے باعث ادارۂ ادبیاتِ اردو دکن میں دکنی ادبیات کا ایک اہم ریسرچ سنٹر بن گیا ہے ۔ ادارہ کی جانب سے دکنی ادب سے متعلق جو کتابیں شائع کی گئی ہیں ان کی افادیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ۔

زیرِ نظر کتاب کو ملک کے مشہور دانشور اور ادارہ ادبیات اُردو کے شریکِ پروفیسر مغنی تبسم صاحب نے مرتب کیا ہے اور مجلسِ تصنیف و تالیف و ترجمہ ادبیات اردو کے زیرِ اہتمام شائع کیا جا رہا ہے جس کے معتمد محمد منظور احمد صاحب ہیں توقع ہے کہ یہ کتاب ادارہ کی جانب سے شائع کردہ دیگر کتابوں کی طرح اردو کے علمی و ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

رمن راج سکسینہ

معتمد اعزازی ادارۂ ادبیات اردو

۱۶ / مئی ۱۹۸۹ء

پیش لفظ

"نگارشاتِ زورؔ" ڈاکٹر سیّد محی الدّین قادری زورؔ مرحوم کے چند منتخب مضامین کا مجموعہ ہے جو ارُدو فاضل کے نصاب میں شامل کرنے کی غرض سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں دو مضامین اردو زبان کے بارے میں ہیں۔ پہلا مضمون "اردو" ہندی اور پنجابی" ڈاکٹر زورؔ نے پروفیسر مسعود حسین خاں کی کتاب 'مقدمۂ تاریخ زبان اُردو' کی اشاعت کے بعد تحریر کیا تھا۔ انھوں نے اردو زبان کے آغاز کے بارے میں پروفیسر مسعود حسین خاں کے نظریے سے اختلاف کرتے ہوئے بعض ایسے شواہد و حقائق کی طرف توجہ دلائی ہے جن کی روشنی میں اس مسئلے پر مزید تحقیق کی جانی چاہیے "اردو اور قومی یک جہتی" میں ڈاکٹر زورؔ نے اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ اردو زبان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی پیداوار ہے اور قومی یک جہتی کو فروغ دینے میں اس کا اہم حصّہ رہا ہے۔

اس مجموعے میں تین مضامین دکنی شعر و ادب کے بارے میں ہیں۔ ان کے مطالعے سے دکنی کے لسانی اور ادبی ورثے کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

"حالی اور نثر اردو" ایک اہم تنقیدی مضمون ہے۔ اس میں حالی کی نثری خدمات اور ان کی نثر نگاری کے اسلوب کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے غیر جانب داری کے ساتھ حالی کی نثر کی خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالی ہے۔

ادب کے طالبِ علموں کے لیے یہ مضمون، مضمون نگاری اور اسلوب شناسی کے سلسلے میں کار آمد معلومات فراہم کرتا ہے۔

مجموعے میں دو مضامین اقبال پر ہیں۔ پہلا مضمون "مولانا رومی اور اقبال" ایک اچھا تقابلی مطالعہ ہے دوسرا مضمون "اقبال کا اثر اردو شاعری پر" ایک مختصر سا جائزہ ہے جس میں اقبال کی شاعرانہ انفرادیت اور ان کے نظریۂ شعر کے بارے میں چند اہم نکات بیان کیے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ اقبال کے اثر سے اردو شاعری کس طرح ایک نئی راہ پر گامزن ہوئی۔

مضمون "حضرت امجد حیدر آبادی" ان کی وفات پر لکھا گیا تھا۔ امجد وہ بلند پایہ شاعر تھے جنھوں نے رباعی گوئی کے فن کو کمال پر پہنچایا۔ حیدر آباد کو ناز ہے کہ اس سرزمین نے امجد جیسے شاعر کو پیدا کیا جس کا شمار اردو کے چند عظیم المرتبت شعرا میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زور نے حضرت امجد کے مختصر سوانحی حالات بیان کرتے ہوئے ان کے کلام کے محاسن کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ یہ مجموعۂ مضامین نہ صرف طلبہ کے لیے مفید ہے بلکہ عام قارئین کے ادبی ذوق کی تسکین کا سامان بھی مہیا کرتا ہے۔

مئی ۱۹۸۹ء

مغنی تبسم

اُردو ہندی اور پنجابی

اُردو ہندی اور پنجابی نے دراصل ایک ہی سرزمین پہ جنم لیا اور ایک ہی سرچشمے سے پھوٹیں۔ ہند آریائی خاندانِ السنہ رنگا رنگ پھولوں کا ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں ایران و توران، پامیر و تبت اور ایشیائے کوچک کی تہذیبوں اور تمدنوں کی خوشبوئیں مہکتی رہتی ہیں اور گلدستے کے اور پھولوں کے مقابلے میں اُردو ہندی اور پنجابی ہی سب سے زیادہ ان خوبیوں سے مرصع ہیں جو ایشیا کی قدیم عظمت اور برگزیدگی کا مظہر ہیں۔

وہ مقام جہاں ان تینوں زبانوں کی کونپلیں پھوٹیں اور جہاں انھوں نے ابتدائی نشو و نما حاصل کی سرزمینِ پنجاب ہی ہے۔ یہی ہندوستان کا وہ خطہ ہے جو مختلف لسانی تہذیبوں اور زبانوں کا شروع ہی سے سنگم رہا ہے۔ ہندوستان کی ہر نووارد قوم اسی علاقے میں پہلے پہل داخل ہوئی اور اس کی سرسبزی و شادابی اور اس کے باشندوں کی شگفتگی و فراخ دلی سے ایسی خوش و خرم ہوئی کہ پھر اپنے وطن کو واپس ہونے کا نام تک نہ لیا بلکہ یہیں بس گئی اور کچھ عرصہ رہنے کے بعد شاید خوب سے خوب تر کی تلاش میں دوآبہ گنگ و جمن اور اس کے جنوب یا مشرق کے علاقوں کی طرف نکل گئی۔

ان ہی نو وارد قوموں میں وہ ترک ایرانی بھی شامل تھے جو اواخر دسویں صدی عیسوی میں غزنویوں کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئے اور ۱۱۹۳ء تک اس سرزمین کے باشندوں کے ساتھ مِل جل کر ایک نئے اور تازہ دم تمدّن و ریاست کی صورت میں ابھرتے رہے چناں چہ اس پورے دور میں پنجاب ایک آزاد سلطنت بنا رہا جس کا پایۂ تخت لاہور رہا۔ جب ۱۱۹۳ء میں دلّی فتح ہوئی اور غوری سپاہیوں نے اس پر قبضہ کیا تو پنجاب سلطنتِ دہلی کا ایک صوبہ بن گیا اور اس کی انفرادیت ختم ہو گئی لیکن اس سے پہلے کے دو سَو سالوں میں جب کہ پنجاب پر ترک ایرانی حکمران تھے اور جو اپنے ساتھ ایشیا کی زبانیں ترکی اور ایرانی لے آئے تھے اور دیسی باشندوں کے ساتھ گھل مل گئے تھے تو اس قومی اختلاط کے نتیجے کے طور پر ایک بین قومی زبان کا وجود پذیر ہونا ضروری تھا۔

بعض لوگ غلط فہمی یا مقامی یا مذہبی تعصّب کی بنا پر اُردو اور ہندی کو سندھی، یا سنسکرت یا برج بھاشا یا کھڑی بولی کی بیٹی سمجھ لیتے ہیں اور دوسروں کو بھی سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالاں کہ یہ ایک ایسی غلطی ہے کہ اس کو مان لینے کی وجہ سے ہر منزل پر نت نئی غلطیوں کو گوارا کر لینا پڑتا ہے ہندی اور اُردو دونوں زبانوں کے صاحبانِ فضل و کمال اسی غلط فہمی میں مبتلا ہوتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ غلط فہمیاں زیادہ تر یورپی محقّقین اور ماہرینِ لسانیات کی پیدا کردہ ہیں۔

یہ بات عجیب ہے کہ اُردو ہندی اور پنجابی کے اصل تعلق کی نسبت کسی یوروپی ماہرِ لسانیات کا ذہن اب تک منتقل نہیں ہوا۔ اس کی طرف سب سے

پہلے ہندوستانیوں ہی کی توجہ منعطف ہوئی اور ہندوستانی اہلِ قلم ہی نے اردو اور پنجابی کے اس بنیادی تعلّق کو سب سے پہلے بے نقاب کیا۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء میں پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں اس خیال کو نہایت واضح انداز میں دلائل کے ساتھ پیش کیا۔ انھوں نے اپنی کتاب کے صفحات ۸۴ تا ۱۰۳ میں ثابت کیا کہ پنجابی اور اردو دونوں نے ایک ہی اصول کے تحت لسانی اور نحوی ارتقا کی منزلیں طے کیں اور یہ کہ اردو میں چند اجزا ایسے ہیں جن کی توضیح صرف پنجابی ہی کے مطالعے اور اس پر غور و خوض کرنے سے ہو سکتی ہے۔ نیز یہ کہ اردو میں کچھ عناصر ایسے بھی ہیں جن کا حوالہ سوائے پنجابی کے کسی اور زبان میں نہیں۔ ان امور کو تفصیلی طور پر واضح کرنے کے بعد پروفیسر شیرانی لکھتے ہیں:

> "گزشتہ سطور کے مطالعے سے ہم پر یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ اردو اور پنجابی کی صرف کا ڈول تمام تر ایک ہی منصوبے کے زیرِ اثر تیار ہوا ہے۔ ان کی تذکیر و تانیث اور جمع و افعال کی تصریف کا اتحاد اسی ایک نتیجے کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی اور جب سیانی ہو گئی ہیں تب ان میں جدائی واقع ہوئی ہے۔"

(پنجاب میں اردو صفحہ ۱۰۳)

اس کتاب کی اشاعت سے قبل ہی اردو کے آغاز و ارتقا کے موضوع پر میں لندن یونیورسٹی میں لسانی تحقیقات میں مصروف تھا۔ میرے مطالعے

اور تلاش و جستجو میں بھی یہی حقیقت بے نقاب ہوئی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا
کہ میں نے یہ واضح کیا تھا کہ جس زمانے میں اردو پنجاب میں بنی اس وقت پنجاب
اور دو آبہ گنگ و جمن کی زبان میں بہت کم فرق پایا جاتا تھا۔ برج بھاشا،
کھڑی بولی اور جدید مشرقی پنجابی یہ سب زبانیں بعد کو عالم وجود میں آئیں چناں چہ
میں نے اپنے مقالے میں اس نظریے کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا۔ اس مقالے
کی تکمیل کے بعد میں نے صوتیاتی نقطۂ نظر سے اس کی مزید توثیق کی اور اس سلسلے
میں جو عملی تحقیقات کی تھیں ان کو کتابی صورت میں ہندوستانی فونے ٹکس کے
نام سے ۱۹۳۰ء میں پیرس سے انگریزی زبان میں شائع کیا۔ بعد میں اس نظریے
کی مزید وضاحت اور اردو میں اشاعت کی خاطر ایک کتاب ہندوستانی لسانیات
لکھی جو ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد سے شائع ہوئی اس میں اردو کی ابتدا کے بارے
میں مختلف نظریوں پر بحث کرنے کے بعد یہ لکھا گیا تھا:

"اردو اس زبان سے مشتق ہے جو بالعموم "نئے ہند آریائی دور"
میں اس حصۂ ملک میں بولی جاتی تھی۔ جس کے ایک طرف عہدِ حاضر
کا شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے اور دوسری طرف الہ آباد۔ اگر
یوں کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب
میں بارہویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی۔"

(ہندوستانی لسانیات صفحہ ۹۴)

یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ نیا ہند آریائی دور ۱۰۰۰ء کے بعد
ظہور پذیر ہوا تھا اور اسی دور کے بعد چند صدیوں میں ہندوستان کی جدید

بھاشائیں پنجابی، برج بھاشا، ہریانی وغیرہ ظہور پذیر ہوئی تھیں۔ اس سلسلے میں آگے چل کر میں نے ہندوستانی لسانیات میں یہ بھی لکھ دیا تھا:

"اردو پر بانگڑو یا ہریانی زبان کا بھی قابلِ لحاظ اثر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زبان دہلی کے شمال مغرب میں انبالے کے اطراف اس علاقے میں بولی جاتی ہے جو پنجاب سے دہلی آتے ہوئے راستے میں واقع ہے اور دہلی پر حملہ کرنے والوں یا وہاں کے حکمرانوں کے ہمراہ اسی علاقے کے رہنے والے بہیر و بنگاہ کی حیثیت سے دہلی اور اس کے نواح میں آکر آباد ہوئے۔"

(ہندوستانی لسانیات، صفحہ ۹۵)

غرض ۱۹۲۸ء کے بعد سے اہلِ اردو اور ماہرِ لسانیات کے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا ہو گئی اور ہندی اور اردو کے سرزمینِ پنجاب میں پیدا ہونے اور لسانی نشو و نما حاصل کرنے کا نظریہ مستحکم اور مسلّم الثبوت بن گیا۔

۱۹۴۲ء میں اردو کے ایک قابلِ احترام شاعر اور ادیب پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے اپنی کتاب کیفیہ شائع کی تو اس میں بھی انھوں نے میرے اور محمود شیرانی دونوں کے مندرجہ بالا خیالات اور نظریے سے اختلاف نہیں کیا بلکہ صفحات ۲۰ تا ۲۹ پر میرے اس خیال کی کہ اردو کی ابتدا کے وقت شمالی اور شمال مغربی ہند کی زبان تقریباً ایک ہی تھی لیکن ساتھ ہی شاید دہلوی ہونے کی وجہ سے اس واقعے کا صاف طور پر اعتراف نہیں کیا کہ اردو پنجاب ہی میں پیدا ہوئی بلکہ ذرا دامن بچاتے ہوئے یوں لکھ دیا:

"راقم کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ کسی خاص مقام یا خطے کو اُردو
کا مولد ہونے کے امتیاز سے محروم کیا جائے یا یہ طرّہ ایک سے
چھین کر دوسرے کی دستار میں لٹکا یا جائے۔"

اور عجیب بات یہ ہے کہ اُردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کی صریح مخالفت
بھی نہیں کی بلکہ اپنی کتاب کیفیہ کے کئی صفحات میں ایسے اسماء افعال، ضمائر وغیرہ
پیش کیے ہیں جن سے اُردو اور پنجابی کا تعلق ظاہر ہوتا ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ
ان دونوں زبانوں کا رشتہ نہایت گہرا اور قریبی ہے۔ یہ کام در اصل محمود شیرانی
کی کتاب پنجاب میں اُردو کے دلائل کی مزید وضاحت یا ضمیمے کا درجہ رکھتا ہے۔

پنڈت کیفی کے اس گومگو انداز بیان کا اصلی سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ
ان کی کتاب کی اشاعت سے دو سال قبل ہی مولانا سید سلیمان ندوی جیسے فاضل
کی ایک کتاب نقوشِ سلیمانی ۱۹۳۹ء میں شائع ہو چکی تھی۔ اس میں مولانا کے
مختلف مضامین اور خطبے شامل ہیں۔ جن میں سے بعض بہت ہی قدیم یعنی
۱۹۱۵ء کے لکھے ہوئے تھے۔ لیکن ۱۹۳۳ء کے لکھے ہوئے ایک مقالے میں
مولانا ندوی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو سندھ ہی میں بنی ہے۔
چنانچہ وہ طویل بحث کے بعد جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں وہ یہ ہے۔

"قرینِ قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا
ہیولےٰ اسی وادیٔ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔"

(نقوشِ سلیمانی، صفحہ ۳۱)

اس سے پہلے ایک خطبے میں انھوں نے تحریر فرمایا ہے:

"اردو زبان کا پیدا ہونا کسی ایک قوم یا قوت کا کام نہیں بلکہ مختلف قوموں اور زبانوں کے میل جول کا ایک ناگزیر اور لازمی نتیجہ ہے..... اور شاہ جہاں کے عہد کی یادگار بتائی جاتی ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ غوریوں اور خلجیوں اور تغلقوں ہی کے زمانے میں پیدا ہو چکی تھی۔"

(نقوشِ سلیمانی، صفحہ ۶)

ایک اور مضمون میں مولانا نے یہ رائے قائم فرمائی ہے :

"یہ مخلوط زبان سندھ۔ گجرات۔ اودھ۔ دکن۔ پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ دار زبانوں سے مل کر ہر صوبے میں الگ الگ پیدا ہوئی۔"

(نقوشِ سلیمانی، صفحہ ۲۵۱)

یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مولانا سید سلیمان ندوی کے یہ عجیب و غریب بیانات اور متضاد خیالات پنجاب میں اردو اور ہندوستانی لسانیات کی اشاعت کے بعد شائع ہوئے ہیں۔ جن میں اس مسئلے کو شرح و بسط کے ساتھ واضح کر دیا گیا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے ان تحقیقی اور لسانیاتی کتابوں کے مطالعے کی زحمت ہی گوارا نہیں فرمائی۔ لیکن ان کے ان متضاد بیانات اور رایوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد جب پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے قلم اٹھایا تو قطعی طور پر کسی نتیجے پر پہنچنے اور لکھنے سے گریز کیا اور چوں کہ یہ دونوں اصحاب لسانیات سے زیادہ تاریخِ ادب و نقدِ شعر کے ماہر تھے اس لیے اپنے علم و فضل

اور وسعتِ معلومات کے باوجود اس مسئلے سے دور ہو گئے یا شاید انھوں نے دوسرے مصنّفوں کی تحقیق یا نظریے سے متفق و ہم خیال ہونے کو اپنے تبحرِ علمی کے کسرِ شان تصور کیا۔

غرض نقوشِ سلیمانی اور کیفیہ کی اشاعت کے بعد اردو کے آغاز و ارتقا اور مقامِ پیدائش کے بارے میں اردو اور ہندی کے اربابِ قلم پھر تذبذب میں پڑ گئے اور اردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کے مسلّم الثبوت نظریے کو نظر انداز کرنے کا میلان شروع ہو گیا۔ اس رجحان میں شاید اس لیے بھی تقویت پیدا ہونے لگی کہ اس نظریے کے آغاز کا سہرا کسی یورپی محقّق کے سر نہیں باندھا گیا تھا اور ہم ہندوستانیوں کے نزدیک کسی انگریزی یا جرمن یا فرانسیسی مصنف کا نام ہی کسی خیال یا نظریے یا رائے کی صداقت وصحت کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

دوسری وجہ شاید یہ ہے کہ اس میلان کو ہوا دینے والے اردو اور ہندی کے ادیب چوں کہ خود لسانیات پر کافی عبور نہیں رکھتے تھے اس لیے خود ذاتی تحقیق و تفتیش کرنے سے معذور تھے۔ چناں چہ دوسرے بڑے اور مشہور ادیبوں اور مصنّفوں کے خیالات اور رائے ہی کو سند جانتے تھے۔ اور ان ہی کو اپنے مضمونوں اور تحریروں میں اس طرح دہراتے تھے کہ گویا ان کی ذاتی کدوکاوش اور تحقیق کا نتیجہ ہے۔

تیسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سے اکثر صوبہ داری عصبیت کا شکار ہیں۔ اور اتر پردیش اور دہلی کے سوا کسی اور مقام کو اردو اور ہندی کا مرکز

وسنبع ماننے کے لیے تیار نہیں اور ان کا دل نہیں چاہتا کہ دلّی جیسے قدیم تاریخی شہر یا برج کی مقدس سرزمین اور اس کے نواحی علاقے اس عظمت و برگزیدگی سے محروم ہو جائیں اور اُردو ہندی کے آغاز کا سہرا پنجاب کے سر باندھا جائے۔

اُردو اور ہندی کے آغاز و ارتقا سے متعلق اُردو کی بعض جدید لسانیاتی تحریروں کے تجزیے و تشریح سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کی انگریزی کتاب انڈو آرین اور ہندی اور پروفیسر ڈاکٹر سد ھیشور ورما کی اردو کتاب آریائی زبانیں کا بھی تذکرہ کیا جائے۔

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کلکتہ یونیورسٹی میں لسانیات و صوتیات کے پروفیسر ہیں اور ہندوستان کے سب سے بڑے عالم لسانیات اور محقق ہیں۔ ان کی تصنیفات کی اولیت و اہمیت اور ان کے فضل و کمال کی وجہ سے اگر ان کو عہدِ حاضر میں ہندوستانی لسانیات کا امام کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ان کی تحقیقات نے یورپ کے بڑے بڑے ماہرین اور خاص کر لسانیاتی جائزہ ہند Linguistic Survey of India کے مرتب سر جارج ابراہم گریرسن کی غلطیوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ گجرات کی ورناکولر ریسرچ سوسائٹی نے ۱۹۴۰ء میں ان کو ہندی ہندوستانی کے نشوونما پر تقریریں کرنے کے لیے دعوت دی تھی اور یہ تقریریں اس سوسائٹی کی جانب سے ۱۹۴۲ء میں انڈو آرین اور ہندی کے نام سے کتابی صورت میں شائع کی گئی تھیں۔

پروفیسر چٹرجی نے اپنی اس کتاب میں ہندوستانی لسانیات سے ان الفاظ میں اتفاق کیا تھا:

The Language that they (Muslims) first adopted was naturally that current in the Punjab. Even in these days there is not much difference between the Punjab dialects, particularly those of Eastern Punjab from those spoken in the Western most parts of the United Provinces; and eight or nine hundred years ago, we might imagine that the difference was still less: It is even likely that an almost identical speech was current in central and Eastern Punjab and Western United Provinces. (P. 167)

وہ زبان جو انھوں نے سب سے پہلے اختیار کی قدرتی طور پر پنجاب کی مروج زبان تھی ۔ آج بھی پنجاب کی بولیوں میں خاص طور پر مشرقی پنجاب اور اتر پردیش کے انتہائی مغربی علاقوں کی بولیوں میں زیادہ فرق نہیں ہے ۔ یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ آٹھ نو سو سال پیشتر یہ فرق اور بھی کم ہوگا ۔ یہ بھی امکان ہے کہ وسطی اور مشرقی پنجاب (اگر مغربی پنجاب اور ہندو افغانستان کو الگ بھی کر دیا جائے) نیز مغربی اتر پردیش میں تقریباً یکساں بولی رائج ہوگی ۔

اس کے بعد دہلی میں مسلمانوں کی آمد اور وہاں اپنی بنائی ہوئی زبان کو ساتھ لانے کا ذکر چٹرجی نے ان الفاظ میں کیا ہے :

It is likely Punjabi Mohammadans who came Delhi as followers of the Turki and Persian conquerors had the greatest importance of all the Indian groups, in the new capital. They brought their dialect to Delhi, and their dialect, which agreed with those of the districts to the North and North-West of Delhi in some important matters, save the tone and supplied some salient characteristics to the new verkchess prache so business speech which came into being in the new Capital city. (P.P. 168-169)

* امکان ہے کہ وہ پنجابی مسلمان جو ترکی اور ایرانی فاتحین کے جلو میں دہلی وارد ہوئے تھے نئے دارالسلطنت کے تمام ہندوستانی گروہوں میں سب سے زیادہ اہمیت کے مالک ہوگئے ہوں وہ اپنی بولی بھی دلّی لے کر آئے اور ان کی بولی جو دلّی کے شمالی اور شمال مغربی اضلاع کی بولیوں سے بہت سی اہم چیزوں میں طابقت رکھتی تھی نمونہ بن گئی اور اسی سے اس نئی کاروباری زبان کی ممتاز خصوصیات فراہم ہوئیں جو اس نئے دارالسلطنت میں وجود پذیر ہوئی رہی تھی۔

اس بیان کے آخری حصّے میں چٹرجی نے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کی عظمت قائم رکھنے کی کوشش کی ہے لیکن اس سے آگے (چند صفحات

کے بعد ہی) ڈاکٹر چٹرجی اُردو شہ پارے کے حوالے سے اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اُردو بولنے والے پنجاب ہی سے آئے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں :۔

Judging from the kind of speech the descend-ants of the North Indian Muslims, still speak in the Deccan, and from the Language of early Dakhni Poetry of the 16th 17th centuries (cf. Urdu Shah-paare, by Dr. S. Mohiuddin Qadri Hyderabad Deccan Part I 1929), it is clear that they mostly hailed from the Punjab and from the Bangaru and 'Vernac-ular Hindustani' dialects areas of North India"
(P. 184)

دکن میں شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی اولاد جس قسم کی زبان بولتی ہے (نمونے LINGUISTIC SURVEY OF INDIA Vol. IIX Pt. I میں دیکھے جا سکتے ہیں) سولھویں سترھویں صدیوں کی ابتدائی شاعری کی جو زبان تھی (دیکھیے اُردو شہ پارے از ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری حیدرآباد دکن حصّہ اوّل 1929ء) اس کو دیکھتے ہوئے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ پنجاب اور شمالی ہند کے بانگرو اور ہندوستانی کے علاقوں سے یہاں پہنچے تھے۔

مگر بڑا تعجب ہوتا ہے جب سنیتی کمار جیسا محقق آگے کی چند سطروں میں مولانا سید سلیمان ندوی کی طرح یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ دکنی اُردو کسی اور بولی سے بنی اور شمالی اُردو کسی اور بولی سے۔ وہ کہتے ہیں :

The North Indian Vernacular which became established in the South was sister speach to Hindustani, if not exactly identical with it, being of Some Punjab and Western united Provinces origin. (P. 184)

شمالی ہند کے جنوب میں پھیلنے والی یہ علاقائی بولی اگر ہو بہو ہندوستھانی نہ بھی ہو تو اس کی بہن ضرور تھی کہ اس کا مرزبوم بھی مشرقی پنجاب اور مغربی اتر پردیش ہی تھا۔

چند اور سطروں کے بعد چٹرجی پھر اُردو کا اصل وطن پنجاب ہی کو قرار دینے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ چناں چہ شاہ برہان الدّین جانم بیجاپوری کی نظم سکھ سہیلا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

Shah Burhan's language has some distinct Punjabi affinities, and it is noteworthy that he calls it Guj (a) ri as contrasted with Bhaka, i.e. Braj Bhaka. This name Gujri gives an indication of

the origin and affinity of this dialect: evidently the Gujars of the Punjab .... had come in good numbers with the North Indian armies, and they maintained their name and their dialect in the Deccan for some time (P.P. 185- 186.)

شاہ برہان کی زبان میں واضح پنجابی مماثلتیں نظر آتی ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہ اسے بھاکا = بھاکھا یعنی مغربی ہندی بولی (بشمول برج بھاشا) کے گجری یا گجری کہتے ہیں۔ گجری کا نام بھی خود اس بولی کی اصل اور اس کے رشتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یقیناً پنجاب کے گوجر جن کے نام پر گجرات اور پنجاب کے شہر گوجرانوالہ کا نام پڑا شمالی ہند کی فوجوں کے ساتھ بڑی تعداد میں آئے تھے دکن میں بھی انھوں نے کچھ عرصے تک اپنی زبان اور اپنے نام کو برقرار رکھا۔

پروفیسر چیٹرجی نے جو رائے صرف برہان الدین جانم کی ایک نظم کے

بارے میں ظاہر کی ہے وہی رائے دکن کے اکثر و بیشتر شاعروں سے متعلق بھی قائم کی جانی چاہیے۔ کیوں کہ ان سبھوں کی زبان وہی تھی جو شاہ برہان کی ہے۔ اس کے علاوہ دکن کے مہاراشٹرا اور کرناٹک علاقوں کے اکثر مسلمان صورت شکل اور دوسری جسمانی خصوصیات میں بھی آج تک پنجاب اور جموّں وکشمیر کے گوجروں کے مشابہ ہیں۔

پروفیسر چٹرجی کے ان بظاہر متضاد بیانات کے اسباب اور حسن و قبح پر تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ بیانات دوسرے مباحث کے سلسلے میں ضمنی طور پر آگئے ہیں۔ انھوں نے اُردو اور ہندی کے آغاز اور مقام پیدائش کے بارے میں کوئی نظریہ بیان نہیں کیا اور نہ ان تمام دکنی کتابوں کے مطالعے کا ان کو اس وقت تک موقع ملا تھا جو اب شائع ہو چکی ہیں۔ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ مذکورہ بالا بیانات کی وجہ سے اُردو اور ہندی کے ارباب قلم تذبذب میں پڑ گئے۔ اور یہی مبہم رائیں متعدد غلط فہمیوں کی بنیاد بن گئیں چناں چہ اس مسئلے پر اس اثنا میں ان دونوں زبانوں میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں طرح طرح کے شکوک و شبہات راہ پاگئے۔

سنیتی کمار چٹرجی کی تقریروں کے اس مجموعے کی اشاعت کے چند ماہ بعد ہی ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد کی طرف سے پروفیسر ڈاکٹر سدھیشور ورما کی ایک کتاب آریائی زبانیں میرے ہی مقدمے کے ساتھ شائع ہوئی سدھیشور ورما پرنس آف ویلس کالج جموں میں سنسکرت اور لسانیات کے عرصے تک پروفیسر رہ چکے ہیں۔ انھوں نے موضوع کے لحاظ سے آریائی

زبانوں پر تو کتاب میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ لیکن اس کی تمہید میں اردو
اور ہندی کے ماخذ و ارتقا پر بھی سرسری طور پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ یہ
ان کا اصل موضوع نہیں تھا۔ اس لیے انھوں نے نہ تو اس مسئلے پر غور کیا اور
نہ کوئی قطعی رائے ظاہر کی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ انھوں نے نہ تو محمود شیرانی
کی کتاب پنجاب میں اردو ہی پڑھی، نہ پنڈت کیفی کی کتاب کیفیہ اور نہ
ہندوستانی لسانیات کا ہی مطالعہ کیا۔ اگرچہ چٹرجی کی مذکورہ بالا کتاب
انڈو آرین اور ہندی کے جا بجا حوالے دیے ہیں لیکن اردو یا ہندی کے
آغاز کی نسبت یوروپی ماہرینِ لسانیات کے پرانے خیال کو دوہرا دیا
ہے کہ وہ دہلی کے بازاروں اور ضلع میرٹھ کی زبان سے مل کر بنی ہے۔

(دیکھو، آریائی زبانیں صفحہ ۱۲-۱۳)

اس سلسلے میں ان اردو اور ہندی کتابوں کا ذکر ضروری ہے جو
گزشتہ چند برسوں میں شائع ہوئی ہیں ان میں تین کتابیں خاص طور پر قابلِ ذکر
ہیں۔ اس لیے کہ یہ لسانیاتی انداز میں لکھی گئی ہیں اور کچھ نہ کچھ اہمیت رکھتی ہیں۔
اردو کی ان چند کتابوں میں جو اس خاص موضوع پر اب تک شائع ہوئی ہیں
پہلی کتاب پروفیسر احتشام حسین کی کتاب ہندوستانی لسانیات کا خاکہ
ہے۔ احتشام حسین صاحب نے دراصل جان بیمز کی مشہور انگریزی کتاب
کا ترجمہ اپنے سیر حاصل مقدمے کے ساتھ ۱۹۴۸ء میں شائع کیا ہے۔
ان کا مقدمہ دیباچے کے طور پر اس کتاب کے ساتھ شریک ہے اور بجائے
خود ایک اچھے مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں احتشام صاحب نے

اس موضوع کی تمام مطبوعہ کتابوں کے مطالعے کا عمدہ نچوڑ نہایت سلجھے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے لیکن بڑی حیرت ہوتی ہے جب یہ جملہ بھی اس مقدمے میں نظر سے گزرتا ہے۔

"جیولز بلاک (فرانسیسی ماہر لسانیات) نے جو نظریہ پیش کیا ہے اور جسے ڈاکٹر زور نے تسلیم کیا ہے وہ یہ ہے کہ ابتدا میں پنجابی اور کھڑی بولی میں صرف تدریجی فرق رہا ہو گا۔ بعد میں ایک پنجابی بن گئی اور دوسری کھڑی بولی۔" (ہندوستانی لسانیات کا خاکہ صفحہ ۵۲)

حالاں کہ نہ جیولز بلاک نے یہ نظریہ پیش کیا اور نہ میں نے کہیں اپنی کتابوں میں ان کے کسی نظریے کی وضاحت یا تائید کی۔ اس نظریے کے اگر کوئی بانی قرار دیے جا سکتے ہیں تو وہ حقیقت میں پروفیسر چٹرجی ہیں۔ جن کی طرف میں نے ہندوستانی لسانیات میں صفحہ ۹۰ اور ہندوستانی فونے ٹکس میں صفحہ ۱۹ پر اشارہ کیا ہے۔ پروفیسر جیولز بلاک نے در اصل اپنے ایک مضمون میں کہا تھا کہ ہندوستانی کے آغاز اور ارتقا پر غور کرتے وقت دہلی کے اطراف واکناف کی بولیوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اور ان کا یہ مضمون اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز لندن کے بلیٹن میں ۱۹۲۸ء میں اس وقت چھپا تھا جب کہ میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل ہو چکا تھا۔ اگر یہ مضمون اس ترتیب کے دوران میں چھپتا تو میں نواحِ دہلی کے نظریے کی تائید تو یقیناً نہیں شاید تردید ہی کرتا۔ اور اس کے خلاف وضاحتی دلائل درج کرتا۔

پروفیسر جیولز بلاک خود بھی محمود شیرانی کی کتاب اور میری تحقیقات

سے اس وقت تک ناواقف تھے اور جب میں ۱۹۲۹ء میں لندن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر لینے کے بعد ڈی لٹ کے لیے پیرس پہنچا اور اسکول پیسی ریار دے لانگ دیواں میں پروفیسر جیولز بلاک کے ساتھ گجراتی فارم آف ہندوستانی پر مقالہ لکھنا شروع کیا تو وہ اس وقت ان مباحث اور نظریات سے پوری طرح واقف ہوئے۔ چناں چہ پیرس ہی سے ہندوستانی فونےٹکس شائع ہوئی تو اس پر خود پروفیسر جیولز بلاک ہی نے مقدمہ تحریر فرمایا اور چوں کہ وہ خطۂ پنجاب کے اثرات کی اہمیت کو سمجھ چکے تھے اس لیے انھوں نے اپنے اس مقدمے میں اس کی کوئی مخالفت بھی نہیں کی۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے ہندوستانی مصنّفوں کے لیے کسی یورپی محقق کا نام ہی ضمانت کا کام دیتا ہے اس لیے پروفیسر جیولز بلاک کے اس ابتدائی اشارے کو صحیح اور مختتم سمجھ لینے کے بعد پروفیسر احتشام حسین نے اپنے مقدمے کو اردو کے آغاز اور جائے پیدائش سے متعلق کسی قطعی نتیجے تک پہنچے بغیر ہی ختم کر دیا ہے۔

یہی حال اس کی ہم عصر ایک اور کتاب مقدّمۂ تاریخ زبانِ اردو کا کا ہے اس کو ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے پی ایچ' ڈی کے مقالے کے طور پر ترتیب دیا تھا۔ یہ مقالہ بھی بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ اس کتاب میں اگرچہ زیادہ تر پروفیسر سنیتی کمار چیٹرجی کا انداز نظر اختیار کیا گیا ہے اور ان ہی کی تحلیقات سے صحیح طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔ مگر اس میں بھی جیولز بلاک کے مذکورہ بالا مضمون کو بنیاد قرار دے کر

پوری کتاب میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ پنجابی سے توجہ ہٹا کر ہریانی کو آگے بڑھایا جائے۔ اور کچھ اس انداز میں کتاب لکھی گئی ہے اور کچھ ایسی فنی بحثیں کی گئی ہیں کہ پنجابی واقعی پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین یہ تو مانتے ہیں:

"یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے طلوع کے وقت ہریانی اور پنجابی میں خطِ فاصل قائم کرنا دشوار تھا۔"

(مقدمہ تاریخِ زبانِ اُردو صفحہ ۱۰)

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ عجیب و غریب خیال بھی ظاہر کرتے ہیں:

"البتہ شورسنی اپ بھرنش کی جانشین ہونے کی حیثیت سے پنجابی زبان کے مقابلے میں ہریانی اور کھڑی بولی کو زیادہ قدیم ماننا پڑے گا۔" (مقدمہ تاریخِ زبان اُردو صفحہ ۱۰)

حالاں کہ شورسینی اپ بھرنش کا مفروضہ خود معرضِ خطر میں ہے اور مزید تحقیق طلب ہے جائے کہ اس کی قدامت اور اس کے جانشینوں کے حقوق کی پالادستی ...

ڈاکٹر مسعود صاحب سے اس کتاب میں ایک اہم فرد گزاشت یہ ہوئی ہے کہ انھوں نے موجودہ پنجابی اور موجودہ ہریانی کا مقابلہ قدیم دکنی سے کر کے نتائج اخذ کیے ہیں۔ حالاں کہ ہندی اور اُردو نے جس وقت پنجاب میں نشوونما حاصل کیا اس وقت ہریانی اور کھڑی تو کجا خود برج بھاشا بھی ایک جداگانہ زبان کی حیثیت سے عالمِ وجود میں نہیں آئی تھی۔ اور خود انھوں نے پروفیسر شیرانی

کے اس نظریے کو مان لیا ہے کہ ہر زبان کی پیدائش مسلمانوں کی آمد دہلی کے بعد ہی عمل میں آئی ہے۔ (دیکھو مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو صفحہ ۱۳۱)

ڈاکٹر مسعود حسین مانتے ہیں کہ لاہور کی ترکی ہندی فضا میں خواجہ مسعود سعد سلمان پرورش پاتے ہیں جو ہندوی زبان کے بھی پرگوشیہ شاعر تھے۔
(دیکھو مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو صفحات ۱۲۸-۱۲۹)

اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں:

"خواجہ مسعود کسی ہندوی زبان میں بھی شاعری کرتے تھے اور شاید ان کا دیوان خسرو کے وقت تک دستیاب تھا۔"

لیکن یہ نہیں کہہ سکتے یا یہ کہنا نہیں چاہتے کہ یہ ہندوی زبان کونسی تھی اس لیے قیاس قائم کرتے ہیں کہ یہ زبان لاہوری ہوگی۔

یہ ایک عجیب قیاس ہے۔ جب ہمیں معلوم ہے کہ امیر خسرو ہر جگہ کی زبانوں کا فرق جانتے تھے اور اپنے عہد کے بہت بڑے ماہر اور محققِ لسانیات تھے چناں چہ انھوں نے اپنے عہد کی ہندوستانی زبانوں کی فہرست بھی لکھ دی تھی۔ جس کو خود مسعود صاحب نے بھی زیرِ بحث کتاب کے صفحہ ۱۳۷ پر نقل کیا ہے۔ ایسی صورت میں اگر مسعود ابنِ سعد ابنِ سلمان کی زبان لاہوری ہوتی تو امیر خسرو اس کو لاہوری لکھتے۔ اور اگر ان کی زبان اور مسعود کی زبان میں فرق ہوتا تو وہ ضرور یہ بھی واضح کر دیتے کہ میں نے دہلوی میں شاعری کی ہے اور مسعود کے دیوان کی زبان لاہوری ہے۔ لیکن اس کی بجائے خسرو نے اپنی اور مسعود دونوں کی زبانوں کا نام "ہندوی" لکھا ہے۔ اور در اصل یہی "ہندوی" اردو ہندی دونوں کی

ابتدائی شکل تھی ۔ یہ دونوں زبانیں عرصے تک ایک ہی رہیں اور ان کا نام بھی
ایک ہی رہا۔

جب ۱۷۹۰ء میں انگریزوں نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی حکمتِ عملی
کے طور پر اس کی (یعنی بقول گارساں دتاسی ہندوی یا ہندوستانی کی) کتابوں
کو دو جداگانہ رسم خط یعنی فارسی اور دیوناگری میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی طرف
سے چھپوانا شروع کیا تو اہلِ ہندی رفتہ رفتہ اُردو سے علاحدہ ہونے لگے اور
اپنی زبان کا تعلق کبھی برج بھاشا، کبھی اودھی، کبھی راجستھانی اور کبھی کسی اور
وسطی ہند آریائی زبان سے ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگے اور یہ سب جدوجہد
اس لیے کی جانے لگی کہ ہندی کو ایک قدیم، مقدس اور عظیم الشّان ادبی و لسانی
ورثے کا وارث ثابت کریں اور اردو سے اُسے ایک بالکل جدا زبان ظاہر کریں۔

ڈاکٹر مسعود حسین کی کتاب مقدّمۂ تاریخِ زبان اُردو کے سلسلے میں ایک
اور بات بھی واضح کر دینی ضروری ہے کہ اس کتاب میں اس امر پر غور نہیں کیا گیا
کہ ہندی اور اُردو کے اولین شاعر امیر خسرو نے اپنی زبانوں کی فہرست سے ہندوی
کو الگ ہی رکھا تھا۔ اس لیے کہ یہ زبان اس وقت تک بین صوبہ جاتی حیثیت
اختیار کر چکی تھی۔ خسرو کے عہد میں یہ کوئی مقامی زبان نہیں رہی تھی۔ اور انھوں
نے مقامی زبانوں کے جو نام لکھے ہیں وہ اس وقت تک معروف اور متعیّن ہو چکے تھے۔
ان مقامی زبانوں کی فہرست میں انھوں نے برج بھاشا کو دہلوی اور پنجابی کو لاہوری
لکھا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے غلطی سے دہلوی ہی کو اردو سمجھ لیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہوتا تو

امیر خسرو پر یہ الزام رہتا کہ انھوں نے برج بھاشا جیسی اہم زبان کا اپنی فہرست میں ذکر ہی نہیں کیا۔

اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسعود صاحب ہریانی کو اُردو کا ماخذ منبع سمجھ بیٹھے اور اس کو ثابت کرنے کی کوشش میں ان کی پوری کتاب مبہم و متضاد بیانات سے معمور ہو گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب محنت اور تلاش و جستجو سے لکھی گئی ہے اور مولف نے لسانیاتی مسائل سے بڑے شغف اور واقفیت کا ثبوت دیا ہے لیکن انھوں نے محض جیولز بلاک کے ایک مفروضے اور اشارے کی بنا پر ایک پورا نظریہ قائم کرنے کی غلطی کی اور پنجاب میں اُردو اور ہندی کے وجود پذیر ہونے کے نظریے کو غلط ثابت کرنے کی سعی میں اپنی ساری قابلیت بے جا طور پر صرف کر دی۔

عہدِ حاضر کی ایک اور جدید لسانیاتی کتاب اُردو زبان کا ارتقا ہے۔ یہ ڈاکٹر شوکت سبزواری کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے اور ۱۹۵۶ء میں ڈھاکہ سے شائع ہوا ہے۔ اس میں بھی مغربی مصنّفین کے اقتباسات اور ان کے موقع و بے موقع حوالے کثرت سے درج ہیں۔ اس کے مرتب شوکت سبزواری نے ایک ستم ظریفی یہ کی ہے کہ مولوی عبدالحق مرحوم کے ادبی و تنقیدی مضامین کے بعض ٹکڑوں اور بیانات کو بھی بطورِ سند پیش کیا ہے حالاں کہ مولوی صاحب کو نہ ماہرِ لسانیات بننے کا کبھی خیال آیا اور نہ انھوں نے کبھی جدید لسانیات کی تالیفات اور تحقیقات کی طرف توجہ ہی کی۔

اس کتاب میں بھی مسعود حسین خاں کی طرح جدید لسانیاتی اصولوں سے

کام لینے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے آخری ابواب میں اردو کے اکثر الفاظ کے صوتی ولسانیاتی ارتقا پر فنی طریقے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان حصّوں سے زیادہ تر معلومات دوسروں سے ماخوذ ہیں اور مصنّف نے محض مرتب کا کام کیا ہے۔ اصل مسئلے کے بارے میں شوکت سبزواری بھی یو۔پی مصنّفوں کے اقتباسوں اور متضاد بیانات کی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ اور اردو کے آغاز کے بارے میں کوئی قطعی رائے نہیں دے سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقالہ ڈگری حاصل کرنے کی غرض سے مرتب کیا گیا تھا اسی لیے مقالہ نگار نے پہلو بچانے کی کوشش کی ہے۔

اتنا ضرور ہے کہ اردو زبان کا ارتقا کے مطالعے سے آئندہ تحقیقاتی کام کرنے والوں کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے اردو کے آغاز و ارتقا پر غور کرنے کے امکان سمجھائی دیں گے اور یہ بات پالی زبان سے ہندی اور اردو کے تعلق اور مناسبت سے متعلق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پالی بھی ہندی و اردو کی طرح ایک زمانے میں تمام ہندوستان میں پھیل چکی تھی اور اس کی طرف غور کرنا اردو و ہندی کے ارتقائی مسائل طے کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔ چوں کہ اب تک کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی اس لیے یہ مسئلہ قابلِ توجہ نظر آتا ہے۔ خود شوکت سبزداری بھی اس بارے میں زیادہ واضح رائے نہیں رکھتے۔

یہی حال ان ہندی کتابوں کا بھی ہے جو اس عرصے میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے اکثر کے مولف جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے شاید اردو سے دور ہونے کی وجہ سے یا معاشرت کے پرچار کی خاطر ہندی کا رشتہ براست سنسکرت

سے ملانے میں پس و پیش نہیں کرتے، وہ پراکرت اور اپ بھرنش دور اور عہد بہ عہد ترقیوں اور تبدیلیوں کو یا تو نظر انداز کر دیتے ہیں یا ان سے واقف ہونا ہی نہیں چاہتے۔ ان کے لیے سب سے سہل راستہ یہی ہے کہ سیدھے سنسکرت تک پہنچ جاتے ہیں اور اپنی زبان کو اسی کی ایک جدید شکل قرار دیتے ہیں حالاں کہ ہندوستان کی ہر آریائی زبان سنسکرت ہی کی مرہونِ منت ہے اور اس سلسلے میں ہندی کو کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہے، سوائے اس کے کہ موجودہ ہندی میں فنی اصطلاحیں اسی سرچیون سرچشمے سے حاصل کی جارہی ہیں۔ اور کوشش ہورہی ہے کہ رفتہ رفتہ ہندی کو سنسکرت بنا دیا جائے۔ مگر ماہرینِ لسانیات جانتے ہیں کہ کبھی کوئی زبان پیچھے کی طرف نہیں جاتی۔ بلکہ جتنا آگے کی طرف بڑھے گی اتنی ہی جلد ترقی کرے گی۔

ہندی میں معمولی الفاظ گاؤں اور دیس وغیرہ کو قدیم یا سنسکرت تلفظ کے ساتھ گرام اور دیش وغیرہ بولا اور لکھا جارہا ہے۔ لیکن لسانیاتی اور صوتی اقتضا کے تحت یہ تلفظ رفتہ رفتہ پھر گاؤں اور دیس ہی بن جائے گا اور اس وقت پھر اردو اور ہندی کا موجودہ مصنوعی فرق دور ہو جائے گا۔

اتنی بات ظاہر ہے کہ ایسی کوششوں اور ایسی کتابوں کی اشاعت کے بعد ہندی اور اردو کے آغاز و ارتقا کے بارے میں انتشارِ خیال پیدا ہونا ضروری ہے۔ آج ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے پر تُلا ہوا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ کوئی تنظیم جس کی حیثیت کل ہند نوعیت کی ہو ان مبہم و متضاد بیانات اور آرا کا تجزیہ کرے، غلطیوں اور غلط فہمیوں کی تردید دلائل کے

ساتھ کی جائے اور ایسی مبسوط کتاب مرتب اور شائع کی جائے جس میں لسانیاتی نقطۂ نظر اور تحقیقاتی انداز میں جدید ہند آریائی اور اردو ہندی اور پنجابی کے آغاز و تعلقات پر بحث ہو۔

اس کتاب میں اس بات کو بھی صاف طور پر واضح کرنا پڑے گا کہ ہریانی زبان کی ابتدا ہندوی یعنی ہندی، اردو اور پنجابی کی ابتدا کے بعد عمل میں آئی۔ اگر قدیم دکنی اردو کی بعض خصوصیات ہریانی زبان سے ملتی جلتی ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اردو اور ہندی ہریانی سے ماخوذ ہیں بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ اردو ہندی اور ہریانی سب کا سرچشمہ ایک تھا۔

قدیم دکنی اردو کی بہت سی کتابیں اس اثنا میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکی ہیں ان میں سے اکثر ایسی ہیں جن تک شیرانی، چیٹرجی اور مسعود حسین خاں کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اب قدیم ترین زبان کے ان نمونوں کا گرونانک، تلسی کبیر داس، سور داس اور خود چند بر دائی کی زبان سے مقابلہ کر کے ان کے آپس کے لسانی اختلافات کو واضح اور تعلقات کو معیّن کرنا پڑے گا۔

دکن کی طرح گجرات، مالوہ اور خاندیس کے قدیم مصنفین کی کتابوں اور نظموں کی زبان بھی اس مقابلے و موازنے میں زیرِ بحث آئے گی، اس لیے کہ ان علاقوں میں بھی سرزمین پنجاب ہی کے فیض یافتہ اور پروردہ یافتہ حضرات صدیوں سیاسی اور علمی حیثیت سے برسرِ اقتدار رہے ہیں۔

ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر جو کتاب مرتب ہو گی اس سے نہ صرف ہندی و اردو کی ابتدا اور جائے پیدائش کے مسئلے کی یکسوئی ہو جائے گی بلکہ پنجابی

اور پنجاب سے ہندی و اردو کے اور بنیادی تعلق کے بارے میں جتنے جا بجا
کے ہندی و اردو ادیبوں اور محققوں کے دماغ میں جو شکوک و شبہات پیدا
ہو چکے ہیں ان کا ازالہ بھی ہو سکے گا۔ اس طرح اردو ہندی اور پنجابی تینوں
زبانوں کے ارباب علم کو معلوم ہوگا کہ یہ زبانیں باہم دگر کتنی پیوستہ ہیں اور
صرفی نحوی اشتقاقی اور صوتی خصوصیات میں پہلے بھی کتنی متحد تھیں اور آج بھی
کتنی ہم آہنگ ہیں۔ افسوس ہے کہ آج کل ادبی تحقیق بھی سیاست کی زد میں ہے
ہر زبان کے ادیب اور عالم سیاست دانوں سے متاثر ہو کر علم و تحقیق کو بھی
سیاست کا اکھاڑا بنا دینا چاہتے ہیں، اور ایسی باتیں لکھتے ہیں جن سے جنتا
اور سیاست داں خوش ہوں، خواہ وہ کتنی ہی غلط اور بے بنیاد کیوں نہ ہوں

اُردو اور قومی یکجہتی

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے۔ اس میں ہزاروں سال سے قسم قسم کی زبانیں اور طرح طرح کی بولیاں رائج رہی ہیں۔ اس کے مختلف حصے اپنی اپنی آب و ہوا، رسم و رواج، اور لباس و طرزِ معاشرت کی رنگارنگی کے باعث ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور متضاد حالات و کیفیات کے آئینہ دار رہے ہیں۔ لیکن ان تمام نیرنگیوں کے باوجود ایک خاص مشرقی ستان اور تمدنی آن اس پورے برصغیر میں شروع سے جلوہ گر رہی ہے۔ ہندوستان میں فکر و خیال کی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے پہلے سنسکرت زبان اس کے بعد پالی نے اور دورِ جدید میں اُردو نے بہت بڑا حصہ لیا ہے۔

اُردو زبان اس ملک میں دراصل سنسکرت اور پالی کی جانشین ہے۔ سنسکرت اور پالی کا ایک خاص کلچر تھا ایک خاص انداز تھا جو کشمیر سے راس کماری تک اور گجرات سے آسام تک دوسری علاقائی بولیوں کو متاثر کرتا تھا اور جس نے ہندوستان کے اپنے بسنے والوں کو خواہ وہ نسل کے لحاظ سے دراوڑی ہوں یا آریائی، منگولی ہوں یا مونڈا ایک ہی رشتے میں پرو دیا تھا۔ اسی طرح

اردو نے بھی تمام ہندوستان کو متاثر کیا ہے اور اس وسیع ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ کر وہاں کی زبانوں پر اثرانداز ہوئی اور خود بھی ان کا اثر قبول کیا اردو کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جس طرح سنسکرت اور پالی نے ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں کو اپنے اثر و اقتدار کے زمانے میں ختم نہیں کیا اسی طرح اردو نے بھی "جیو اور جینے دو" کے اصول پر عمل کیا ہے یہی وجہ ہے کہ جن علاقوں میں اردو کے بڑے بڑے شاعر، ادیب اور سرپرست بادشاہ اور مربّی امیر پیدا ہوئے اور جو اردو کا مرکز تھے، وہاں کی مقامی زبانیں بھی برابر سرسبز و شاداب رہیں اور اردو کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی رہیں۔

گجرات میں مظفر شاہیوں کے دور میں اردو کے بڑے بڑے شاعر پیدا ہوئے اور اردو کی بیسیوں مثنویاں اور کتابیں لکھی گئیں لیکن گجراتی زبان برابر قائم رہی اور وہاں کی اردو گجراتی کے لفظوں اور محاوروں سے مستفید ہوتی رہی۔ بیجاپور میں جو کنڑ زبان کا مرکز تھا اردو کے ایسے شاعر اور فن کار پیدا ہوئے جن پر اردو آج بھی ناز کرتی ہے: ابراہیم عادل شاہ نورس، نصرتی، علی عادل شاہ شاہی، ہاشمی اور رستمی کے اردو کارناموں میں کنڑ زبان اور کرناٹکی قوم کے الفاظ و خیالات موجزن ہیں لیکن وہاں اردو کے ساتھ ساتھ کنڑ زبان پھلتی پھولتی رہی۔ گولکنڈہ اور حیدرآباد میں جو آندھرا قوم اور تلگو زبان کے وسط میں واقع ہے گزشتہ پانچ سو سال سے اردو کا رواج رہا اور یہیں محمد قلی قطب شاہ، وجہی، ابن نشاطی اور بیسیوں شاعر و ادیب پیدا ہوئے جن کے شاہکاروں میں تلگو الفاظ ملتے ہیں مگر اردو کبھی تلگو کی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہوئی اور تلگو بھی ساتھ ساتھ

ترقی کرتی رہی۔ صرف اتنا نہیں بلکہ اس طویل دور میں اردو دوست بادشاہوں اور امیروں نے تلگوئی بھی مساویانہ سرپرستی کی۔ احمد نگر اور اورنگ آباد مہاراشٹر کے دل سمجھے جاتے تھے اور وہاں صدیوں اردو کا طوطی بولتا رہا۔ اور ولی و سراج جیسے عظیم الشان شاعر بھی پھلے پھولے مگر مرہٹی بھی برابر پروان چڑھتی رہی۔ آگرہ جو برج بھاشا کا مرکز رہا ہے وہ میر تقی میر، نظیر اکبر آبادی اور مرزا غالب کی جنم بھومی بھی رہا ہے۔

غرض اردو نے جہاں بھی اپنا ڈیرا ڈالا خود بھی پروان چڑھی اور مقامی زبان کو بھی آگے بڑھایا۔ اس کی تازہ مثال کے طور پر کشمیری کو لیجیے کہ یہاں اردو قدرے دیر میں روشناس ہوئی تھی۔ لیکن اس نے اپنی پیشرو زبانوں سنسکرت اور فارسی کے مقابلے میں کشمیری زبان کے ساتھ نہ صرف فیاضانہ سلوک کیا بلکہ اہلِ کشمیر کو کشمیری کی طرف متوجہ کرنے کا باعث بھی بنی۔ سنسکرت اور فارسی کے دور میں یہ زبان علم و ادب اور شعر و سخن کے لیے اتنی زیادہ استعمال نہیں کی گئی جتنی اردو کے زمانے میں یہ پروان چڑھ رہی ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ کشمیر میں اب اردو کا رواج کم ہو رہا ہے۔ اردو بھی پھیل رہی ہے اور ترقی کر رہی ہے اور کشمیری اور اس کے ساتھ ڈوگری بھی ریاستِ جموں و کشمیر میں مقبول ہو رہی ہیں۔

اردو کے اس صدیوں کے رواداری انداز ہی میں اس کے آغاز و ارتقاء کا راز چھپا ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو کی ابتدا ہی قومی یکجہتی کے احساس اور باہمی ہم آہنگی کی ضرورت کا نتیجہ تھی اس کی بنیاد ایک ایسے زمانے میں پڑی جب پورا ہندوستان مختلف ریاستوں اور علاقائی گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک نئی قوم

ہندوستان میں داخل ہو کر اس سرزمین کو اپنا وطن بنانے لگی تھی اور اپنے ساتھ ایران و توران اور عراق و عرب کے تہذیبی اور لسانی اثرات بھی لا رہی تھی۔ اس قوم کے افراد پہلے پنجاب اور سندھ میں آباد ہوئے پھر بارہویں صدی کے آخر میں دلی اور دوآبے میں داخل ہوئے اور اس کے بعد انھوں نے گنگ و جمن کی زرخیر وادی میں اس نئی ہند ایرانی تہذیب کی بنیاد ڈالی جس کا عروج امیر خسرو کی شاعری اور تاج محل کی صنّاعی میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ہندوستان آنے والے نو وارد سمرقند، بخارا، اصفہان و شیراز اور بغداد و بصرا کے قدیم تہذیبی اثرات کو بھی ساتھ لائے۔ اہلِ ہند کے لیے یہ اثرات نئے بھی تھے اور جاں بخش بھی۔ مہاتما بدھ کی اہنسا کی تعلیم کے ساتھ اسلام کا تصوّرِ تسلیم و رضا میل بھی کھاتا تھا اور مختلف بھی تھا۔ اہلِ ہند اس نئے رنگ کو تعجب و تجسّس کی نظر سے دیکھنے لگے اور نو واردانِ بساطِ ہند یہاں کے فلسفہ و علوم اور سماج کی رنگا رنگی میں دلچسپی لینے لگے۔ رفتہ رفتہ دونوں طرف سے یہ کوشش شروع ہوئی کہ ایک دوسرے کو سمجھیں اور ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ اس لین دین اور قرب و اتصال کے لیے ضروری تھا کہ اشاروں کنایوں سے آگے بڑھ کر ایک ایسی بولی اختیار کریں جس میں کچھ یہاں والوں کے شبد اور کچھ نوواردوں کے الفاظ ہوں۔ اس زمانے کی اپ بھرنش میں رنگا رنگ الفاظ کی اسی آمیزش کو بعد میں ریختہ یا ہندوی کہا گیا۔

یہ ہندوی سب سے پہلے پنجاب میں بنی۔ اس لیے کہ وہاں تقریباً دو سو سال تک تاریخی تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے لیے قومی یکجہتی کا عمل جاری تھا۔

اس کے بعد اختلاط کا یہ سلسلہ دلی و آگرہ میں شروع ہوا۔

لیکن ابھی دلی اور آگرے کی زبان کا اثر اس نئی بولی پر پوری طرح پڑنے نہ پایا تھا کہ اس کے بولنے والے علاء الدین خلجی اور محمد تغلق کے زمانے میں دکن پہنچے اور دکن میں یہی نا پختہ کھڑی زبان تقریباً چار سو سال تک وہاں کی بھانت بھانت زبانوں کے درمیان پروان چڑھتی رہی۔ جو لوگ دو آبہ گنگ و جمن میں رہ گئے ان کی زبان برج بھاشا ہریانوی اور مغربی ہندی کی دوسری شاخوں سے متاثر ہونے لگی اور آخر کار کھڑی بولی کی صورت میں ظاہر ہوئی یہی کھڑی زبان اب اردو اور ہندی دو الگ الگ زبانوں کی حیثیت سے ہندوستان اور پاکستان میں جاری و ساری ہے۔ پنجاب میں اردو نے قومی یکجہتی کے جو کامیاب تجربے کیے ان کے بارے میں اگرچہ تفصیلی معلومات امتدادِ زمانہ کے باعث مفقود ہو گئیں لیکن جب سلاطینِ تغلق کے دور میں دلی میں پھر اس قسم کی کوششیں شروع ہوئیں اور فیروز شاہ تغلق نے بطورِ خاص اس کی طرف توجہ کی تو اس دور کے سب سے بڑے شاعر اور موسیقار حضرت امیر خسرو نے اردو سے بھی کام لیا۔ انھوں نے تہذیبی اختلاط اور ارتباط کی قوتوں کو فروغ دیا اور شعر و ادب اور موسیقی کے ذریعے ہندوستانیوں کو غیر ہندوستانیوں کے دلوں سے قریب کر دیا اور اس طرح مشترک ہندوستانی تہذیب کی نئی قدروں کو جنم دیا۔ ان کے گیت گھر گھر پہنچ گئے اور ان سے لطف اندوز ہونے والوں میں ہندی یا ترکمانی کا امتیاز باقی نہ رہا۔ یہ دراصل خسرو کے دل کا سوز اور روح کا نور تھا۔ جس نے اس زبان کو بہت جلد مقبولِ عام بنا دیا۔

ساتھ ہی امیر خسرو کی ادبی دیانت نے یہ گوارا نہ کیا کہ ہندوی زبان کی سرپرستی

کا سہرا اپنے ہی سر باندھ لیں۔ انھوں نے اپنے دیوان "غرۃ الکمال" کے دیباچے میں صاف صاف لکھ دیا کہ میں پہلا شخص نہیں ہوں جو اس زبان میں ریختے اور گیت لکھ رہا ہوں بلکہ مجھ سے پہلے لاہور میں ایک شاعر مسعود، ابن سعد، ابن سلمان نے بھی اس زبان میں گیت گائے ہیں۔

امیر خسرو کے بعد قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کی قدروں کی ترویج کرنے والوں کا کاروان آگے چل پڑا۔ بہار میں حضرت شمس الدین یحییٰ منیری، دکن میں حضرت صدرالدین محمد حسینی بندہ نواز، گجرات میں حضرت شاہ علی جیو گام دھنی ایسے بزرگ نظر آتے ہیں جو گیارہویں صدی سے سولہویں صدی تک ان تہذیبی قدروں کی اشاعت کے لیے اُردو زبان سے کام لیتے رہے۔ یہ بزرگ ہندو اور مسلمان کی اصطلاح میں سوچتے ہی نہ تھے۔ ان کے نزدیک خلقِ خدا کے مسائل ایک نوعیت اور یکساں اہمیت کے تھے اور اسی لیے وہ اپنی فارسی و عربی زبان کی مسندوں سے نیچے اُتر کر ہندوی یا اُردو کے فرش پر آ بیٹھے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے فیض پانے والوں کو نسل و رنگ یا زبان و لباس کے تفرقوں میں اُلجھائیں۔

صوفیوں کے ساتھ ساتھ اس دور کے بادشاہوں اور امیروں نے بھی اُردو کی اس غیر معمولی قوّت کو محسوس کر لیا۔ وہ سمجھ گئے کہ صوفی اس کے ذریعے سے فقیری میں بادشاہی کرنے لگے ہیں اور عوام و خواص جوق در جوق ان کے گرد جمع ہونے لگے ہیں۔ اب انھوں نے بھی ترکی و فارسی کو رفتہ رفتہ خیرباد کہنا شروع کیا۔ اور اردو کی سرپرستی کرنے لگے۔

تہذیبی رواداری ہی کے ماحول میں بیجاپور اور حیدرآباد جیسے شہروں

کی تعمیر ہوئی۔ بیجاپور کا بادشاہ ابراہیم عادل شاہ ثانی عوام میں صدیوں تک جگت گرو کے لقب سے یاد کیا جاتا رہا اور محمد قلی قطب شاہ کا نام حیدرآباد میں آج تک عزت سے لیا جاتا ہے اور اُردو کے ذریعے سے اس کی قائم کی ہوئی تہذیبی روایتیں اس زمین کے چپّے چپّے پر نقش ہیں چناں چہ انھیں کی بنا پر آندھرا میں تلگو کے ساتھ ساتھ اُردو کو بھی علاقائی زبان مان لیا گیا ہے حالاں کہ ہندوستان کے کسی اور صوبے یا ریاست میں سوائے کشمیر کے اُردو کو یہ حیثیت باوجود جدّ وجہد کے آج تک حاصل نہیں ہو سکی۔

دکنی ادب

دکنی ادب اصل میں اُردو کا وہ قدیم ترین ادب ہے جو مغلوں کے یہ دکن آنے سے پہلے لکھا گیا ہے چوں کہ اٹھارویں صدی سے پہلے ملک کے کسی خطے میں اس زبان کو ادبی اغراض کے لیے استعمال نہیں کیا گیا تھا اور صرف ہندوستان کے جنوبی علاقوں میں اس میں کتابیں اور طویل نظمیں اور غزلیں لکھی گئی تھیں اس لیے اس کو دکنی ادب کہا جاتا ہے۔

جس زبان میں یہ ادب لکھا گیا تھا وہ اس دور میں لاہور سے ترچناپلی تک پھیل چکی تھی اور شمالی ہند کے تمام شہروں اور بازاروں میں لب ولہجہ کے کم و بیش اختلافات کے ساتھ بولی جاتی تھی۔ لیکن وہاں اسے نظم و نثر کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ البتہ لاہور میں مسعود ابن سعد سلمان، دہلی میں امیر خسرو اور بہار میں یحییٰ شمس الدین منیری نے اس میں کچھ کلام بھی لکھا تھا لیکن وہ نہ تو پوری طرح دستیاب ہوتا ہے، نہ اس کے مستند نمونے ہی ملتے ہیں۔ اس لیے اردو کا قدیم ترین ادب آج تک اسی کو سمجھا جاتا ہے۔ جو دکن کے چند مشہور شہروں مثلاً گلبرگہ، بیدر، بیجاپور، احمد نگر، گولکنڈہ اور اورنگ آباد اور کڑپہ وغیرہ کے ادیبوں اور شاعروں نے قلم بند کیا تھا اور جس کا بہت کچھ

حصہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی آج تک قلمی کتابوں اور بیاضوں میں محفوظ چلا آرہا ہے۔ اس ذخیرے کا کچھ حصہ انجمن ترقیِ اُردو اور ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی توجہ سے گزشتہ ربع صدی میں چھپ کر منظرِ عام پر آچکا ہے۔

دکنی ادب کی اشاعت سے پہلے عام طور پر سمجھا جاتا تھا کہ اُردو زبان اکبرِ اعظم کے دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے بنی ہے اور جہاں اکبر نے بہت سی نئی نئی تحریکیں چلائیں اور نت نئے کام کیے ان ہی میں ہندوستان کی مشترکہ زبان کی ترویج بھی شامل ہے۔ مگر دکنی اُردو کی کتابوں نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ زبان سلطنتِ مغلیہ کے بانی اور اکبرِ اعظم کے دادا ظہیر الدین بابر کی آمدِ ہندوستان سے صدیوں پہلے ہی وجود میں آچکی تھی اور اکبر کے زمانے تک تو اتنی ترقی کر چکی تھی کہ اس میں نظم و نثر کی بیسیوں کتابیں لکھی گئی تھیں۔

دکنی ادب کی اشاعت سے اُردو زبان کے بہت سے تاریخی اور لسانی مسائل کو حل کرنے میں بھی مدد ملی ہے۔ سب سے پہلے تو پتہ چلا کہ یہ زبان دلّی اور اس کے نواح میں نہیں بنی بلکہ اس کی تعمیر و تشکیل مسلمانوں کی فتحِ دہلی اور پرتھوی راج کی شکست یعنی ۱۱۹۲ء سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اور جب دہلی کے ایک سلطان علاؤ الدین خلجی نے ۱۳۱۰ء میں اپنے سپہ سالار ملک کافور کو کوہستانِ دکن فتح کر کے دہلی کی سلطنت میں شامل کرنے کے لیے روانہ کیا تو اس کی فوج میں جو سپاہی تھے ان میں سے بعض دکن ہی میں رہ گئے اور بعد کو جب سلطان محمد تغلق کے ساتھ ۱۳۲۸ء میں شہرِ دہلی کے اکثر و بیشتر باشندے دکن چلے گئے تو ان میں سے بھی کئی خاندان وہیں بس گئے اس طرح یہ لوگ

جو زبان بولتے ہوئے دکن پہنچے تھے وہ دکن ہی میں رہ گئی اور ان اثرات سے محروم ہو گئی جو بعد کو شمالی ہندوستان کی اُردو پر اس کی ہم سایہ زبانوں اور خاص کر برج بھاشا سے پڑ رہے تھے۔

غرض اُردو زبان کی یہ قدیم شکل دکن کے ان باشندوں میں بھی عام طور پر رائج ہو گئی جو یا تو وہاں کے اصلی باشندے تھے یا ان ایرانی اور عرب مہاجرین کی اولاد تھے جو صدیوں قبل دکن کے مغربی ساحلوں سے داخل ہو کر جنوبی ہند میں آباد ہو گئے تھے۔ جب ۱۳۴۷ء میں بہمنی سلطنت دولت آباد میں قائم ہوئی اور دکن اور شمالی ہند سیاسی حیثیت سے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تو اُردو بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک شمالی اُردو اور دوسری دکنی اُردو۔ اور اسی لیے موخر الذکر میں جو ادب لکھا گیا اسے دکنی ادب کہا جاتا ہے۔

دکنی ادب کی پہلی نثری کتاب معراج العاشقین ہے۔ اس کے مصنف خواجہ صدرالدین سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز ہیں۔ یہ دلی کے رہنے والے تھے اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے ایک مرید شاہ راجو سید یوسف حسینی کے فرزند تھے اور انھیں کے ساتھ کم عمری میں دکن چلے گئے تھے۔ وہ شاہ نصیرالدین چراغِ دہلی کے خلیفہ اور بہت بڑے صوفی اور دکن کے متعدد صوفی سلسلوں کے بانی تھے۔ انھوں نے فارسی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھیں جن میں معراج العاشقین بہت مقبول اور معروف ہے اور کئی بار چھپ چکی ہے[1]۔ اسے پہلے ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ اور اب چند برس ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر خلیق انجم کے ایڈیشن بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

---

[1] اب یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچی ہے کہ معراج العاشقین حضرت بندہ نواز کی تصنیف نہیں ہے۔ (مرتب)

شیخ عین الدین گنج العلم، شاہ امیر الدین، میراں جی شمس العشاق اور شاہ برہان الدین جانم وہ اصحاب طریقت ہیں جنھوں نے دکنی زبان کی نظم و نثر پر مزید اضافہ کیا۔ میراں جی نے اگرچہ تصوف و عرفان کے مضامین پر نظم و نثر لکھی مگر ان کی بعض مثنویاں مثلاً خوش نامہ ادبی لطافتوں اور معنوی حلاوتوں سے معمور ہیں۔ برہان الدین جانم کی مثنوی ارشاد نامہ۔ اور نثر کی کتاب کلمۃ الحقائق بھی چھپ چکی ہیں۔

یہ تو زیادہ تر مذہبی ادب کا دور تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے غیر مذہبی ادب کا سنگ بنیاد در اصل شہر بیدر میں رکھا گیا۔ یہ بہمنی سلطنت کا آخری پایۂ تخت تھا۔ اور خواجہ بندہ نواز کے ایک مرید و معتقد بادشاہ یعنی احمد شاہ ولی البہمنی نے اس کو آباد کیا تھا۔ بیدر کے مشہور اردو شاعروں میں نظامی اور فیروز خاص اہمیت رکھتے تھے۔ موخر الذکر شاعر تو دکنی ادب کی تاریخ میں معمارِ اوّل کی حیثیت رکھتا ہے۔ چناں چہ گولکنڈے کے اردو شاعر اس کو دو صدیوں تک یاد کرتے رہے۔ فیروز بیدر سے گولکنڈہ آیا تھا اور یہاں اس نے خود اپنا دبستانِ سخن قائم کر لیا۔ چناں چہ محمد قلی قطب شاہ کا درباری ملک الشعرا ملا وجہی اسی کے دبستان سے تعلق رکھتا تھا۔

اکبرِ اعظم کے معاصر دکنی تاجداروں میں ابراہیم عادل شاہ نورس والیِ بیجاپور اور محمد قلی قطب شاہ معانی والیِ گولکنڈہ خود بھی اعلیٰ پایہ کے شاعر اور شعر و سخن کے زبردست سرپرست تھے۔ ان کے درباروں میں متعدد اعلیٰ پائے کے سخنور موجود تھے، جن کے کارنامے قدیم اردو ادب کے شاہکار

سمجھے جاتے ہیں۔ بیجاپور کے عبدل نے ۱۰۱۲ھ میں ابراہیم نامہ لکھا تھا جس میں ابراہیم عادل شاہ کی سرکار، دربار اور اس کے لوازماتِ شاہی کا بڑا دلچسپ نقشہ کھینچا ہے۔ یہ دراصل اردو زبان کی پہلی اردو سوانح عمری ہے جو آج سے ۳۷۰ سال قبل مرتب کی گئی ہے گولکنڈہ کے ملا وجہی ۱۰۱۸ھ میں اپنے سرپرست محمد قلی قطب شاہ کی حیاتِ معاشقہ ایک لطیف پیرائے میں افسانوی طور پر بیان کی ہے۔ یہ اصل میں ایک آندھرا قاصد بھاگ متی حیدر محل سے ولی عہد کی عشق و عاشقی کا قصہ ہے اور داستان نگاری و مثنوی نگاری کی بہترین تکنیک پر ملتی ہے۔

دکنی ادب کا گلِ سرسبد سلطان محمد قلی قطب شاہ تھا جو معانی اور قطب دونوں تخلص استعمال کرتا تھا۔ اس کا دیوان دستیاب ہونے سے پہلے تک ولی اورنگ آبادی کو اردو کا باوا آدم سمجھا جاتا تھا۔ مگر محمد قلی قطب شاہ ولی سے ڈیڑھ سو برس قبل گذرا ہے اور اس کے کلام میں جملہ اصناف سخن قصیدہ، مثنوی، رباعی، مرثیہ اور غزل کے نمونے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اس نے پچاس ہزار اردو شعر لکھے اور وہ اردو کے علاوہ فارسی اور تلگو زبانوں میں بھی شاعری کیا کرتا تھا۔ اس نے نظیر اکبر آبادی کی طرح ایسے موضوعات پر بھی شاعری کی ہے جن کی طرف اس کے بعد کے اردو شاعروں نے توجہ ہی نہیں کی۔ وہ رند مشرب اور عاشق مزاج شاعر تھا۔ اس کی غزلیں صحیح رنگِ تغزل کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اس نے مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں جن میں اپنے محبوبوں کے سراپا اور ان کی نفسی اور تحت التحریری کیفیتوں کو بڑی چابک دستی سے قلم بند کیا ہے۔ اس نے خلوت و جلوت کے

ایسے اچھے سرقعے پیش کیے ہیں، جو دوسری زبانوں میں اس تفصیل اور نزاکت سے شاید ہی بیان کیے گئے ہوں۔ اس نے عوام کی عیدوں، میلوں، رسم و رواج بازاروں، پھلوں اور موسموں کی بھی ایسی تفصیلات اپنے کلام میں محفوظ کر دی ہیں، جو اور کہیں نہیں ملتیں۔ محمد قلی کا پورا کلام شائع ہو چکا ہے اور ایک انتخاب "معانیِ سخن" بھی چھپ چکا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کی طرح بیجاپور کا فن پرست حکمران ابراہیم عادل شاہ ثانی جگت گرو ابراہیم اور نورس تخلص کرتا تھا۔ وہ فنونِ لطیفہ اور خاص کر موسیقی و مصوری کا دلدادہ تھا۔ اس نے موسیقی سے متعلق ایک کتاب نورس لکھی تھی جو شائع ہو چکی ہے۔

دکنی ادب کا دوسرا دور عبداللہ قطب شاہ والیِ حیدر آباد اور اس کے بھانجے علی عادل شاہ ثانی شاہی والیِ بیجاپور کے عہد کی علمی و ادبی کاوشوں پر مشتمل ہے۔ عبداللہ اور شاہی دونوں کے دواوین حیدر آباد سے شائع ہو چکے ہیں۔ مگر دونوں شعر و ادب کے سرپرست اور شعرا و مصنّفین کے قدردان تھے۔ وہ زمانہ دراصل دکنی ادب کے عروجِ کمال کا زمانہ تھا۔ اس دور میں جو اساتذۂ فن گزرے ہیں، مجموعی حیثیت سے ویسے شاعر پھر دکن کو نصیب نہ ہوئے۔

بیجاپور میں رستمی، نصرتی، ہاشمی اور مرزا اردو کے بہت بڑے شاعر تھے۔ نصرتی کی رزمیہ اور بزمیہ مثنویاں علی نامہ اور گلشنِ عشق چھپ چکی ہیں۔ اس نے سودا سے سو سال قبل ایسے بلند پایہ قصیدے لکھے تھے کہ اردو زبان ان پر آج بھی ناز کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے اس استادِ سخن پر ایک

بلند پایہ کتاب "نصرتی ملک الشعرائے بیجاپور" مرتب کر کے شائع کی تھی۔ ہاشمی کا دیوانِ ریختی بھی ادارۂ ادبیاتِ اردو کی طرف سے چھپ چکا ہے۔ اس کی اشاعت سے پہلے انشا اور رنگین کو ریختی کا موجد سمجھا جاتا تھا مگر ہاشمی کے دیوان نے ریختی کی تاریخ ہی بدل ڈالی ہے۔

اس دور کے حیدرآبادی ادیبوں اور شاعروں میں وجہی، غواصی، ابنِ نشاطی سربرآوردہ ہیں۔ وجہی نے اردو کا پہلا تمثیلی ناول "سب رس" ۱۰۴۵ء میں ایسے دلچسپ انداز میں لکھا ہے کہ اس کی داد ہر زمانے میں دی جائے گی۔ سب رس اُردو کے ادبِ عالیہ میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کتاب کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم نے تیس سال قبل مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ وجہی استعارے کا بادشاہ تھا۔ قطب مشتری کے قصّے کی طرح سب رس میں بھی اس نے داستانوی لطافتوں کا حق ادا کیا ہے۔

مُلّا غواصی نصرتی کی طرح اعلیٰ پائے کا استادِ سخن اور وجہی کا مدِمقابل تھا۔ اس نے بھی بڑے معرکے کے قصیدے لکھے ہیں۔ طویل مثنویاں، طوطی نامہ اور سیف الملوک و بدیع الجمال بھی لکھیں اور مرصع غزلیں بھی۔ یہ سب شائع ہو چکی ہیں۔

ابنِ نشاطی کی مثنوی پھولبن میر حسن کی مثنوی بے نظیر و بدرِ منیر کی طرح مثنوی نگاری کے اعلیٰ محاسن سے معمور ہے اور اسی طرح مقبول بھی ہوئی ہے۔ اس مثنوی میں ابنِ نشاطی نے بزعمِ خود جملہ صنائع بدائع استعمال کیے ہیں مگر ان کے باوجود پھول بن نہایت سلیس اور شگفتہ مثنوی ہے۔

دکنی ادب کا یہ چار سو سالہ عہد ابوالحسن قطب شاہ اور ولی اورنگ آبادی پر ختم ہو جاتا ہے۔ ابوالحسن "تانا شاہ" کے نام سے پورے ہندوستان میں اپنی نازک دماغی اور خودداری کے باعث مشہور ہے۔ چوں کہ اورنگ زیب نے اس کی سلطنت فتح کر کے اس کو قلعۂ دولت آباد میں قید کر دیا تھا' اس لیے اس کے مال و متاع کی طرح اس کا کلام بھی لٹ گیا اور اس کا کوئی مکمل مجموعہ دستیاب نہ ہو سکا۔ جو کچھ کلام ملا ہے اس سے اس کی نزاکتِ خیال اور معنی آفرینی نمایاں ہے۔

ولی اورنگ آبادی ایک قلندر منش شاعر تھا۔ بیجاپور اور گولکنڈے کی دکنی سلطنتیں اس کی آنکھوں کے سامنے نیست و نابود ہو چکی تھیں اور وہاں کی علمی و ادبی چہل پہل' کتب خانے اور فنونِ لطیفہ کے شاہکار مالِ غنیمت کی شکل میں اورنگ آباد کے گلی کوچوں میں منتشر ہو رہے تھے۔ دکنی شعر و ادب کے سرپرست امیروں اور بادشاہوں کے دربار اجڑ چکے تھے۔ ایسے دور میں ولی کی شاعری میں قلندرانہ خصوصیات کا پیدا ہونا فطری بات ہے۔ ولی صبح جی ایک قلندر تھا۔ دکن کی سیاسی افراتفری اور انتشار نے اس کو بھی آوارہ رکھا وہ کبھی احمد آباد پہنچا کبھی برہان پور اور کبھی شاہ جہاں آباد دہلی کی گلیوں' خانقاہوں اور بازاروں میں نظر آنے لگا۔ اس کی اسی سیر و سیاحت کی بدولت دکنی زبان اور شاعری جگہ جگہ روشناس ہونے لگی۔ چناں چہ اسی کا نتیجہ تھا کہ دلی میں حاتمؔ' آبروؔ وغیرہ دورِ اوّل کے شاعروں نے فارسی گوئی ترک کر کے اردو میں لکھنا شروع کیا اور اس طرح اردوے معلیٰ میں شعر و ادب کا باقاعدہ آغاز ہوا اور دکنی زبان کا ادب رفتہ رفتہ پس منظر میں چلا گیا۔

ہندوستان محمد قلی قطب شاہ کی نظر میں

محمد قلی قطب شاہ اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر اور اُردو ادب کا سرپرست تھا۔ وہ ہندوستان کے ایک مشہور و معروف شہنشاہ اکبر کا ہم عصر تھا۔ ۱۵۶۵ء میں پیدا ہوا۔ پندرہ سال کی عمر میں ۱۵۸۰ء میں گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کا بادشاہ بنا اور صرف ۴۶ سال کی عمر میں ۱۶۱۱ء میں فوت ہوا۔ لیکن اس قلیل مدت میں اس نے تورانی الاصل ہونے کے باوجود ہندوستان کی سرزمین پر ایسی ایسی یادگاریں چھوڑی ہیں جو رہتی دنیا تک اس کے نام کو اس ملک کے عاشق اور اہل ملک کے سچے بہی خواہ کی حیثیت سے زندہ رکھیں گے۔

شہر حیدرآباد اس نے بنایا۔ چار مینار کی عمارت اسی کے اعلیٰ تخیل کا نمونہ ہے۔ اور پھر اس نے اپنی آخری آرام گاہ جس گنبد کی شکل میں تعمیر کرائی تھی، اس سے بھی ہندوستان کی محبت اور اہل ہند کے کلچر اور تمدن کا احترام آج تک نمایاں ہے۔ اس نے عام اسلامی گنبدوں سے ہٹ کر ایسی وضع کا گنبد بنایا۔ جس کا نچلا حصہ مندروں کا ہم شکل ہے اور جس سے ہند اسلامی طرز تعمیر کی ایک نئی روایت قائم ہو گئی چنانچہ بعد کو حیدرآباد میں مسجدیں بھی اسی طرز پر تعمیر کی جاتی رہیں۔

محمد قلی قطب شاہ نے اُردو کے علاوہ تلگو اور فارسی میں بھی شاعری کی تھی، مگر اس کا اُردو کلام ہی محفوظ رہا جو جملہ اصنافِ سخن کے اعلیٰ نمونوں سے معمور ہے۔ یہ کلام زبان اور موضوع دونوں کے لحاظ سے نہایت اہم ہے زبان کے لحاظ سے اس لیے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ دیسی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ دیسی الفاظ کی اسی کثرت کی بنا پر آج ارباب ہندی محمد قلی کو نرملتِ ہندی ہی کا شاعر سمجھتے ہیں، اُردو کا نہیں۔ موضوع کے لحاظ سے اس لیے کہ اس نے عام فارسی اور اُردو شاعروں کی طرح رسمی و روایتی موضوعوں پر نہیں لکھا بلکہ ایسے مضامین اور موضوعات پر بھی غزلیں نظمیں اور قصیدے لکھے جن کی طرف عام شاعروں کی نظر ہی نہیں پڑی یا پڑی تھی تو وہ ان کو شعر و سخن کا موضوع بنانے کے قابل ہی نہیں سمجھتے تھے۔

محمد قلی قطب شاہ نے ہندوستان کے موسموں، پھلوں، پھولوں، درختوں، تہواروں اور ہندوستانی عوام کے رسم و رواج اور رہن سہن پر بڑی عمدہ عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔ وہ بادشاہ ہونے کے باوصف صحیح معنوں میں ایک عوامی شاعر تھا۔ وہ زندگی کے عوامی پہلوؤں پر انھیں کی طرح نظر ڈالتا اور انھیں کی طرح دلچسپی لیتا تھا۔ حیدرآباد کو اس نے ایک اوپن گارڈن سٹی یعنی کھلے ہوئے شہر باغات کے طور پر بسایا تھا۔ اور جب اس کے ہاتھوں کے درخت پھولے پھلے اور اس نے سڑک سے گزرتے ہوئے ان کو دیکھا تو ان پھولوں اور پھلوں کی تعریف میں ایک نظم لکھی جس کے چند شعر یہ ہیں۔ جن سے اس کی زبان اور اسلوب دونوں کا اندازہ ہو سکے گا:

سڑک تھے باغ کوں دیکھت کُھلے غُنچہ باغ کے غنچے
سو اس غنچے کے باساں سے لگیا مگمگ ہمن سارا
دسے ناسک کلی چنپا بھوواں دو پات ہیں تس کے
بھنورتل دیکھ اس جاگہ ہوا حیران ہمن سارا
اناراں میں سہے دانے سو جوں یاقوت پتلیاں میں
ہر اک پھل اس اناراں پر ہے سکے ہمن سارا
دِسیں ناریل کے پھل یوں زمرد مرتباناں جوں
ہور اس کے تاج کوں کہتا ہے پیالہ کر دکھن سارا
دِسیں جامون کے پھل بن میں نیلم کے ہمن سالم
نظر لاگے نہ تیوں میویاں کوں راکھیا ہے جتن سارا
صفت کرنے کوں سوسن بھی کھولیا ہے دس زباں اپنی
دِکھن سب سندریاں کے تئیں کھلیا نرگس ہمن سارا

یعنی جب میں سڑک سے باغ کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایسے کھلے ہوئے غنچے نظر آتے ہیں جن کی خوشبو سے سارا جہاں مہکا ہوا ہے۔ چنپا کلی کے پھول ناک کی طرح اور اس کی پتیاں بھوؤں کی طرح ہیں۔ ان پر بھونرا تل کی طرح نظر آتا ہے۔ جس کو دیکھ کر میرا دل حیران رہ جاتا ہے۔ اناروں میں سے دانے یوں نظر آتے ہیں جیسے کانچ کی ڈبیوں میں یاقوت۔ ناریل کے پھل زمرد کے مرتبان نظر آتے ہیں ان کے تاج کو سارا دکن پیالہ کہتا ہے۔ جامن کے پھل ایک سالم نیلم کی طرح ہیں اور ان کو اس لیے باغ میں لگایا گیا ہے کہ چمن کو نظر نہ لگے۔ اس باغ

کی تعریف کرنے کے لیے سوسن بھی اپنی دس زبانوں کے ساتھ کھلے ہیں اور نرگس کے پھول دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسینانِ دکن کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔

ہندوستانی پھلوں اور پھولوں پر محمد قلی نے اسی طرح متعدد نظموں میں خیال کیا ہے۔ ہندوستان کے موسموں، برسات، گرمی اور سردی پر بھی اس نے کئی اظہار نظمیں لکھی ہیں۔ خاص کر آغازِ موسمِ برسات پر تو اس کی پندرہ نظمیں بڑی بلند پایہ اور دلچسپ ہیں۔ دکن میں جس روز بارش شروع ہوتی اسے آج بھی مرگ کا دن کہتے ہیں۔ اور مرگ لگنا یعنی بارش شروع ہونا ایک قومی تہوار ہے۔ جسے عوام و خواص سب دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ محمد قلی بھی اس تہوار بڑے شوق سے مناتا تھا اور اس تہوار کو اپنی نظموں میں مرگ سال آنے کے نام سے یاد کرتا ہے۔ مثلاً :-

سہیلیاں مرگ سال آیا ہوا سوں :- گرجنا اس کا سہتا ہے اداسوں

مرگ سال آیا سرتھے مرگ نینی سنگاراں کر

چرٹت مانک بھوبیٹیاں لعل موتیاں لے کے دھاراں کر

محمد قلی نے ہندوستان کی برسات کی تفصیلات جی کھول کر بیان کی ہیں۔ ایک نظم میں لکھتا ہے۔ (نظم کا خلاصہ)

آسمان پر فرشتوں نے مرگ کے مہینے کو دعوت دی اور اس خوشی میں سمندر کے موتیوں کو آسمان سے برسایا جن سے ہمارے صحن بھر گئے۔

زمین نے سر پر جواہر کی پگڑی باندھلی اور انگ میں کانچ کے رنگ کی چولی پہن لی۔ لعل یمن جیسی بیر بھوٹیاں تمام ملک میں نکل آئیں۔

ہر طرف ہرے بھرے جنگل دیکھ کر چاروں طرف سے مور کوک رہے ہیں۔
ہرے جنگل میں لال لال پھول نہیں ہیں بلکہ زمرد کی لگنوں میں شبنمی تیل سے شمعیں
جل رہی ہیں۔

اس تازگی و طراوت کو دیکھ کر موہنیاں اپنے خوش رنگ جسموں پر رنگ
برنگ کے لباس اور زیور سجائے ہوئے اپنے جوبنوں کی بہار دکھاتی ہوئی ناز و
انداز کے ساتھ محوِ خرام ہیں۔

ہوا کا نظارہ کرنے کے لیے مست سہیلیوں نے شراب پی لی ہے اور چنبیلی
کے پھولوں میں بھونرے ملہار کے گیت گاتے پھر رہے ہیں۔

ایک اور نظم کا خلاصہ ہے :

بارش کا موسم آیا اور کلیوں کا راج شروع ہو گیا۔ اب ہری ہری ڈالیوں
کے سروں پر پھولوں کے تاج پہنائے جائیں گے۔

مینھ کی بوندوں کا پیالہ ہاتھ میں لے لڑکیوں کہ ہر مہ جبین نہایت
سج دھج کر آئی ہے۔

جسم ٹھنڈ کی وجہ سے لرز رہے ہیں اور جوبن کپکپا رہے ہیں پیا کا چہرہ دیکھ کر
چولی خود بخود پھٹی جا رہی ہے۔

چاروں طرف گرج کی آواز سنائی دیتی ہے اور مینھ برستا ہے۔
عشق کے ترانوں سے موروں نے چمنوں کو معمور کر دیا ہے۔
محمد قلی نے اسی طرح موسم سرما پر بھی لکھا ہے۔ وہ اس نظم کو اس طرح
شروع کرتا ہے :-

ہوا آئی ہے لے کے ٹھنڈ کالا ؛ پیا بن ستاتا بدن بالے یالا

ڈسے سیتل ہوا منجہ لگے نین پیا بن ؛ مگر پیو کنٹھ لا کرے منجہ نہالا

ہندوستان کے مشہور تہوار بسنت پر بھی اس نے کئی نظمیں اور قصیدے لکھے ہیں۔ جن میں بسنت کھیلنے اور اس تہوار سے لطف اندوز ہونے کے رنگارنگ مرقعے پیش کیے گئے ہیں۔ یہ نظمیں موضوع کی مناسبت سے بہت رنگین اور شوخ ہیں۔ ایک نظم میں وہ اس قسم کے خیالات ظاہر کرتا ہے:

میرے مندر میں بسنت سعادت کی خبر لے آیا۔ اس کے آنے سے میری آنکھوں کا چمن پھولوں اور پھلوں سے معمور ہو گیا۔

بسنت کے پھول نے دوسرے تمام پھولوں کو مہمان بن کر آنے کی دعوت دی اور اس تقریب میں گلاب کو پیالہ بنا کر خدمت کرنے کی غرض سے لے آیا۔

بسنت کی روشنی سے تمام دنیا میں پھول کھل گئے اور آسمان پر لال رنگ چھا گیا۔ سورج کی دھوپ میں بسنت ہی کا رنگ جھلکتا ہے اور چاند کے حوض کو بسنت نے چندن بھر کے مہکا دیا ہے۔

بسنت کی وجہ سے ہر گھر میں موتیوں اور یاقوتوں کے انبار لگ گئے۔

اے معانی خدا کا شکر بجا لا کہ تیرے مندر میں رات اور دن خوشی اور آنند کے ساتھ بسنت منایا جاتا ہے۔

ہندوستان کے موسموں اور تہواروں کے ساتھ ساتھ محمد قلی قطب شاہ یہاں کے رسم ورواج اور کھیل کود میں ذاتی دلچسپی لیتا تھا۔ ان سے متعلق اس نے اپنی نظموں میں دلچسپ تفصیلات محفوظ کر دی ہیں۔ ہندوستانی شادیوں میں

مہندی اور جلوے کی جو رنگا رنگ رسمیں ہوتی ہیں، ان کی کیفیتیں کئی نظموں میں بیان کی ہیں۔ جن کے مطالعے سے دلہنوں کے بناؤ سنگھار اور محفلوں کے تکلفات واضح ہوتے ہیں کہ کس طرح ایک طرف بڑے اہتمام سے جلوے کا تخت سجایا جاتا ہے جو کونیں کو چاروں طرف سے موتیوں سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ مشاطائیں دلہن کے ہاتھوں اور پاؤں کو مہندی لگاتیں۔ کندنی کلیوں کے ہار گوندھے جاتے۔ سہیلیوں کو بھی موتیوں کے کناروں کی ساڑھیاں بندھوائی جاتیں۔ سات سہاگنیں مل کر دلہن کے بالوں میں تیل لگاتیں۔ کنگھی کرتیں، چوٹی گوندھتیں، مانگ میں موتی بھرتیں، پیشانی پر چاند کا ٹیکہ لگایا جاتا۔ آنکھوں میں کاجل اور سرمے کے خط کھینچے جاتے۔ مہین کپڑے کا ایسا زریں لباس پہنایا جاتا کہ جسم اس میں سے جھلکنے لگتا۔ غرض اس طرح آراستہ و پیراستہ کر کے ساتوں سہاگنیں دلہن کو جلوے کے تخت پر لا کر بٹھا دیتیں اور اس کے سر پر سہرا اور گلے میں پھولوں کے ہار پہناتیں۔ دولہا اور دلہن دونوں کو شربت پلایا جاتا اور دونوں کے ہاتھوں میں پان کے بیڑے دیے جاتے۔ تاکہ ایک دوسرے کو کھلائیں۔

رسم و رواج کے سلسلے میں محمد قلی نے ہندوستانی ناٹکوں اور نٹوں کے کھیل اور رقص و سرود کی مجلسوں کی جو دلچسپیاں بیان کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح نرسی کی ڈوریاں گوٹوں کی طرح باندھ کر ان کے درمیان نٹ تاروں کی طرح رقص کرتے تھے۔ یہ نٹ ایسے چمک دار لباس پہنتے تھے کہ ان کا بدن سورج کی طرح جھمکتا تھا۔ کانوں میں بندے بجلیوں کی طرح چمکتے تھے۔ وہ طرح طرح کے چھند بندھ کر کے قلابازیاں کھاتے تھے۔ اپنے چہروں کو اس طرح بناتے کہ ان کی آنکھوں

کے قریب خطِ سرمہ ایسا نظر آتا جیسے اژدہا زبانیں نکالے کھڑا ہو۔ ان کے ہاتھوں میں جگہ جگہ مہندی کے نقش ایسے نظر آتے جیسے ہرے ہرے پتّوں میں لال پھول کھلے ہوں۔ اداکاری کے ساتھ ساتھ یہ ایسی باتیں کرتے کہ گویا موتی جھڑ رہے ہوں۔ قلابازیوں کے وقت ان کی پتلی کمر دیکھ کر لوگ چیتے کی کمر بھول جاتے تھے۔ یہ نٹ بھاری بھرکم ہاتھیوں کی طرح مستی اور تنومندی دکھاتے تھے۔ ان کے قد ایسے سیدھے رہتے جیسے تیر۔ جب وہ آہستہ چلتے تو پانی کی طرح آگے بڑھتے اور تیزی میں آتے تو ہوا بن جاتے تھے۔ یہ ایسے چنچل، چُستر اور باکمال تھے کہ انسانوں کے علاوہ فرشتے بھی ان کا کمال دیکھنے آسمان سے اتر آتے۔

ہندوستانی عورتوں کے کھیلوں میں محمد قلی نے چھوکڑی چھو اور ڈھان ڈھکنی کے کھیلوں پر نظمیں لکھی ہیں۔ ایک نظم میں اس کا آغاز اس طرح کرتا ہے :

سکی تاں دے منجہ ٹھٹکتی کھڑی !

کہ ڈھان ڈھکنی کھیل کر ٹھٹکتی کھڑی

آخر میں ان متعدد نظموں اور اشعار کی طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری ہے جن میں محمد قلی نے ہندوستان اور خاص کر دکن کی عورتوں کے سراپا لکھے ہیں اور ان کے حسن و نزاکت کی مدح سرائی کی ہے۔ اس نے ان کی خوبیوں کی بنا پر انھیں دنیا بھر کی عورتوں میں افضل قرار دیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے :

کالیاں گوریاں سکیاں بھو جگت میں جو تھیاں سو بسرا

کوئی سکی کون دیکھت میں اسدہ بھولیا دکن میں

اس کے دیوان میں یوں تو دکن کی تلنگن اور برہمن مہ جبینوں پر کئی نظمیں

ہیں مگر ایک نظم کا عنوان ہندی چھوری ہے جس میں عام ہندوستانی لڑکیوں کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔ اس نظم کے ابتدائی دو شعر یہ ہیں جن سے ہندوستان سے اس کی دلی محبت جھلکتی ہے:

رنگیلی سائیں تجھے تو رنگ بھری ہے
سگڑ سُندر سہیلی گن بھری ہے
لٹکنا بجلی نمنے اس سہاوے
وہ ہندی چھوری بہو چند شہ پری ہے

اُردو شاعری میں وَلی کی اہمیت

وَلی نے تاریخِ ادب میں اپنی کرامت سے جس نمایاں مقام پر قبضہ کر لیا ہے وہ کسی زمانے میں بھی اس سے چھینا نہ جا سکے گا۔ اورنگ آباد کے اس سیاح شاعر کو گزرے ہوئے ڈھائی سو سال کا عرصہ ہو چکا اور اس وقت سے اب تک اُردو ادب نے کئی رنگ بدلے اور اردو شاعری کا قافلہ کہاں سے کہاں نکل گیا۔ لیکن جب کبھی اہلِ قافلہ نے پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش کی، ولی کا کلام ان کو ایک بلند مینار کی طرح رہنمائی کرتا نظر آیا۔

وَلی سے پہلے کے بڑے بڑے اساتذۂ سخن کے اُردو کارنامے اس اثنا میں روشناس ہو چکے ہیں اور یہ بھی قطعی طور پر معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان نہیں تھا۔ لیکن ولی کی کرامت ایسی چل نکلی ہے کہ بد عقیدہ سے بد عقیدہ نقاد بھی اس کے کمالِ انفرادیت سے انکار نہیں کر سکتا شاید یہی خاں کمترین نے اسی لیے پیشین گوئی کر دی تھی کہ :

ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں

سچ تو یہ ہے کہ وَلی اورنگ آبادی اُردو کی زندگی کے ایک ایسے موڑ پر کھڑا ہوا ہے جہاں صحیح رہبری کے بغیر راہ روی مشکل نظر آ رہی تھی اور اندیشہ

تھا کہ کہیں اعرابیوں کی یہ یادگار کعبۂ مقصود کی جگہ کسی ترکستان میں بھٹکتی نہ پھرے۔ ولی ہی کی رہنمائی سے اردو کا لشکر پُر پیچ راہوں سے نکل کر ایک ایسی شاہراہ پر آپڑا جو آخرِ کار اس کو ترقی کے میدان میں پہنچانے کی باعث ہوئی۔

ولی نے اردو شاعری میں سلاستِ بیان اور اندازِ فکر کو کس طرح اجاگر کیا ہے اس کا اندازہ ایک معمولی سی مثال سے یوں لگایا جاسکتا ہے کہ اس سے نصف صدی قبل کے ایک باکمال اردو شاعر نے گولکنڈے کے دربار میں ایک غزل لکھی تھی جس کے تین شعر یوں ہیں :

جب ترا عشق مٹیا دست گریبان میں آ
صبر ٹکڑے ہو پڑیا[۱] عقل کے میدان میں آ
بھولیے ویساں[۲] تھیں[۳] اے چاند ہوں مشتاق ترا
کر مقام آج مری نین کے اسمان میں آ
شعر سوں[۴] جو توں منگے اپ یوّ[۵] سیر کرنے[۶]
سیر کر ذوق سوں[۷] غواصی کے دیوان میں آ

اپنے پیش رو ملک الشعرائے حیدرآباد یعنی ملّا غواصی مصنف "طوطی نامہ" "سیف الملوک و بدیع الجمال" کی اسی زمین میں ولی نے بھی غزل کہی ہے لے اس کے بھی چند شعر سنیے :

وہ صنم جب سوں بسا دیدۂ حیران میں آ
آتشِ عشق پڑی عقل کے سامان میں آ

۱۔ بہت ۲۔ دونوں ۳۔ سے ۴۔ سے ۵۔ یہ ۶۔ کرنے ۷۔ سے

ناز دیتا نہیں گر رخصتِ گلگشتِ چمن
اے چمن زارِ حیا دل کے گلستان میں آ
نالۂ و آہ کی تفصیل نہ پوچھو مجھ سوں!
دفترِ درد دیسا عشق کے دیوان میں آ
عیش ہے عیش کہ اُس مہ کا خیالِ روشن
شمع روشن کیا مجھ دل کے شبستان میں آ
غم سوں تیرے ہے ترحّم کا محل حال ولی
ظلم کوں سے چھوڑ سجن شیوۂ احسان میں آ

پھر اسی ردیف میں قافیہ بدل کر ایک اور غزل لکھی ہے تاکہ اپنی قادرالکلامی اپنے پیش رو شاعر کے مقابل میں ظاہر ہو۔ اس کا مطلع ہے:

اے رشکِ ماہتاب تو دل کے صحن میں آ
فرصت نہیں ہے دن کو اگر تو رین میں آ

غوّاصی اور ولی دونوں قادر الکلام اساتذۂ سخن تھے اور دونوں نے ایک ہی زمین میں غزلیں لکھی ہیں اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ شاعرِ اورنگ آباد نے ملا غوّاصی کے اتّباع میں اس کی زمینیں اختیار کی ہیں اور غوّاصی کو اولیت کا شرف بھی حاصل ہے۔ لیکن ولی کے یہاں زبان اور اندازِ بیان کے نمایاں فرق کے علاوہ لطیف احساسات کی جو نزاکت پائی جاتی ہے در اصل وہی اس کے شاعرانہ کمال کا وہ طرّۂ امتیاز ہے جس نے شاہ جہاں آباد کے فارسی اساتذہ کے ذوقِ سخن کو بدل دیا اور انھیں محسوس کرایا کہ ایک ہندوستانی شاعر اپنی زبان

(اردو) میں جو لوچ اور اثر پیدا کر سکتا ہے وہ فارسی کی شیرینی اور عرصۂ دراز کی موہنی کے باوجود پیدا نہیں ہو سکتا۔

گوناگوں قلبی واردات اور عشق و مستی کی نازک کیفیات کے ادا کرنے کی ہی سہولت تھی جس نے میر تقی میر جیسے اردو شاعری کے خود پسند سرتاج سے یہ کہلوا دیا کہ :

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

میر سے پہلے ان کے حریفِ مقابل مرزا رفیع سودا کے استاد اور دہلی کے مشہور باکمال شاہ ظہور الدین حاتم نے تو بار بار اس دکنی معشوق کے استادانہ سحر طرازیوں کا اعتراف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں :

حاتم یہ فنِ شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں
لیکن ولی، ولی ہے جہانِ سخن کے بیچ

اسی طرح میر کے ایک اور پیش رو اور حاتم کے معاصر نجم الدین مبارک آبرو نے اعلان کیا کہ :

آبرو شعر ہے ترا اعجاز
پر ولی کا سخن کرامت ہے

یہ آبرو وہی ہیں جو میر تقی میر کے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کے شاگرد اور جانشین تھے۔

مشاہیر شعرائے دہلی نے اپنے کلام میں ولی کی یاد نہیں منائی بلکہ ولی کے

ہم وطن شعرا نے بھی ان کی بزرگی اور انفرادیت کا عقیدت مندانہ ذکر موقع بموقع کیا ہے اور یہ امر زیادہ تعجب خیز ہے۔ اس لیے کہ کسی ملک کے باکمالوں کی قدر اُن کے ہم وطن بہت کم کرتے ہیں۔ اور خاص کر سرزمینِ دکن شروع ہی سے اپنے فرزندوں کی ناقدری کے لیے بدنام ہے۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ولیؔ کے ہم وطن شعرا کوہستانِ دکن کے ان باکمال شعرائے پیشین کی شہرت اور کلام سے بخوبی واقف تھے۔ جن کا خود ولیؔ خوردہ گیر تھا اور جن کی غزلوں پر اس نے خود بھی غزلیں لکھی تھیں۔

سراجؔ اور داؤد دونوں ہم عصر باکمال شاعر تھے۔ اور دونوں کو ولیؔ کی جانشینی کا فخر تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ دونوں میں سے کوئی بھی ولیؔ کی جملہ خصوصیات اپنے کلام میں پیدا نہ کر سکا۔ جہاں تک فقر و استغنا اور تصوّف کی چاشنی کا تعلق ہے سراجؔ ولیؔ کے جانشین سمجھے جا سکتے ہیں لیکن شاعرانہ رنگینی اور جذبات کی گوناگونی داؤدؔ کے حصّے میں آئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ولیؔ نے اپنے کمالات کے ورثے کو ان دو شاعروں میں تقسیم کر دیا تھا۔

کلامِ سراجؔ کے سوز و گداز اور تخیّل کی گہرائی کے لیے اُن کی اس مشہور غزل کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے جس کا مطلع ہے:

خبرِ تحیّرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

سراج نے اسی رنگ میں کمال حاصل کیا اور اسی کی حد تک ان کا یہ دعویٰ حق بجانب ہے کہ:

تجھ مثل اے سراج بعد ولی
کوئی صاحبِ سخن نہیں دیکھا

سراج کے مقابلے میں داؤد ایک دنیا دار انسان تھے اور انھوں نے ولی کی رنگین مزاجی اور نزاکتِ بیان کو اپنے کلام میں ترقی دی اور اسی وجہ سے وہ ادبی حلاوت اور نیازمندانہ اثر نہ پیدا کر سکے جو ولی سے عرق سراج کو حاصل ہوا تھا اور جس کی بنا پر ان کا کلام سراج کے مقابلے میں زیادہ مقبول نہ ہو سکا۔ اگرچہ وہ بار بار اس امر کا دعویٰ کرتے رہے کہ :

حق نے بعد از ولی تجھے داؤد
صوبۂ شاعری بحال کیا

مرزا داؤد چوں کہ ایک آصفجاہی منصب دار تھے اس لیے انھیں صوبہ داری اور تعلقہ داری ہی کا خیال آتا رہا۔ وہ ایک اور جگہ کہتے ہیں :

بعد از ولی ہوئے ہیں کئی شاعراں ولیکن
داؤد شعر تیرا مشہور ہے دکن میں

ان کے دیوان میں کئی شعر ایسے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سراج کے مقابلے میں اپنی جانشینی منوانے کے لیے مضطرب ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اپنی غزل میں ولی کے جیسا اثر پیدا کریں۔ اسی خیال کے تحت انھوں نے لکھا کہ :

کہتے ہیں سب اہلِ سخن اس شعر کو سن کر
تجھ طبع میں داؤد، ولی کا اثر آیا !

غرض ولی نے جہاں زندہ دلوں اور رنگین مزاجوں کے لیے ایک شگفتہ

نمونے کلام پیش کیا، آشفتہ حالوں اور صاحب دردوں کی خاطر بھی ایسے ایسے شعر اپنی یادگار چھوڑے ہیں جو کسی طرح میرؔ کے نشتروں سے کم دل دوز نہیں ہیں اور اسی لیے وہ زندہ دلوں اور درد مندوں دونوں کی محفلوں میں ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

ان دونوں اصناف میں انھوں نے جو استادانہ شان دکھائی ہے اس کے نمونے کے طور پر صرف دو چار غزلوں کے منتخب شعر پیش ہیں:

صحبتِ غیر میں جایا نہ کرو
درد مندوں کو کڑھایا نہ کرو
دل کو ہوتی ہے سجن بے تابی
زلف کوں ہاتھ لگایا نہ کرو
ہم کوں برداشت نہیں غصّے کی
بے سبب غصّے میں آیا نہ کرو
پاک بازاں میں ولیؔ ہے مشہور
اس سوں چہرے کو چھپایا نہ کرو

ایک اور غزل کے شعر ہیں:

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
نہ چھوڑے محبت دمِ مرگ تک
جسے یار جانی سوں یاری لگے

ہر ایک وقت مجھ عاشقِ زار کوں !
پیارے تری بات پیاری لگے
ولی کوں کہے توں اگر یک بچن
رقیباں کے دل میں کٹاری لگے

یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں :

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کوں
کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی
مت دور ہو یک آن ولی پاس سوں ہرگز
اے باعثِ جمعیتِ ایامِ جوانی

عہدِ حاضر میں زندگی کی ترجمانی کا جو نظریہ اردو شاعری اور ادب میں اپنی جملہ عریانیوں اور تلخیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے " اس کو پیش نظر رکھ کر بھی اگر ولی کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں اس قسم کی بے باکیوں کے ایسے ایسے نقوشِ اوّلیں نظر آئیں گے کہ اس شاعر اور رنگ آباد کی یاد کبھی محو نہ ہو سکے گی اور معلوم ہوگا کہ طرح طرح کے قید و بند اور قسم قسم کے تکلفات کی دنیا میں رہ کر بھی ولی نے کتنی ذہنی آزادی اور اخلاقی جرات سے کام لیا ہے ۔ مثال کے طور پر صرف ایک موضوع کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے ۔ امرد پرستی اب بھی معیوب ہے اور عہدِ ولی میں بھی معیوب تھی لیکن اس شاعر نے بدنامی اور بے حیائی کے الزام کی پروا کیے بغیر اپنی کئی غزلیں ایسے امردوں کی یاد میں نظم بند کیں جنھوں نے اس کی زندگی اور شاعری کو رنگین بنانے میں خاطر خواہ

حصّہ لیا تھا۔ اگرچہ یہ امر سماج کے قوانین و حجاب کے خلاف تھا لیکن وؔلی زندگی کو بے نقاب دیکھنے کا عادی تھا اور ساتھ ہی اس میں وہ جرأتِ رندانہ بھی موجود تھی جو صرف بے پناہ اُپجی طاقت اور انتہائی اخلاقی قوّت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ اپنے ایک جوانِ رعنا محبوب کی تعریف میں لکھتا ہے:

ترا قد دیکھ اے سیّد معالی
ہوئی روشن دلاں کی فکرِ عالی
ترے پاواں کی خوبی پر نظر کر
ہوئے ہیں گل رخاں جوں نقشِ قالی
شفق لوہو میں ڈوبا سرسوں پگ لگ
تو باندھا سر پہ جب چیرا گلالی
تری انکھیاں دسیں مجھ یوں سیہ مست
پیا گویا شرابِ پرتگالی
گیا ہے خوف سوں اُٹھ لعل کا رنگ
ترے یاقوتِ لب کی دیکھ لالی
تری انکھیاں میں ڈورے دیکھ کر سرخ
بنائی خلق نے ریشم کی جالی
وؔلی تب سوں ہوا ہم کار یہ فرہاد
سنا جب سوں تری شیریں مقالی

اسی طرح اور متعدد دوستوں کا ذکر بے باکی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

بہت سوں کے نام لیے ہیں اور بعضوں کی طرف صرف اس طرح اشارہ کر دیا ہے کہ :

عجب معشوق لڑکا مرہٹہ ہے
کٹیلا اور ہٹیلا لٹ پٹا ہے

عہدِ حاضر میں مزدوروں اور مفلسوں کی ترجمانی اور فلاح و بہبود کا خیال بھی ہمارے ادب اور شعر و سخن کا ضروری عنصر بن گیا ہے۔ اور ہر نیا ادیب یا شاعر (خواہ وہ اس طبقے کی زندگی کا کوئی ذاتی تجربہ بھی نہ رکھتا ہو) ایک فیشن کے طور پر ایسے مضامین کی ٹوہ میں رہتا ہے لیکن ولی نے خود بھی زندگی کی اس دکھتی رگ کے درد و الم کو محسوس کر لیا تھا اور اس نے اپنے کلام میں بعض موقعوں پر نہایت ہی لطیف پیرائے میں ان کی ترجمانی بھی کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :

یہ مرا رونا کہ ہے تیری ہنسی
آپ بس نہیں پر بسی ہے پر بسی
رات دن جگ میں رفیقِ بےکساں
بےکسی ہے بےکسی ہے بےکسی
باعثِ رسوائیِ عالم ولی
مفلسی ہے مفلسی ہے مفلسی

ایک اور شعر ہے : مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

حالی اور نثرِ اردو

ناصحِ مشفق ہیں یاروں کے نہ مصلح اور مشیر
دردمندانِ گے نہ اُن کے درد کے درماں ہیں ہم
پھوٹ پڑتے ہیں تماشا اس چمن کا دیکھ کر
نالۂ بے اختیارِ بلبلِ نالاں ہیں ہم

حالی کی حیات پڑھنے والے کے لیے بہت کم ایسا مواد فراہم کر سکتی ہے کہ وہ کسی دلچسپ فسانے کی طرح محظوظ ہو سکے اگرچہ انھوں نے مستقل محنت اور مسلسل ترقیوں کے ساتھ ایک طویل عمر بسر کی لیکن جہاں تک خارجی حالات کا تعلق تھا ان کی زندگی کے زیادہ تر ایام بالکل خاموش گزر گئے۔ بائیس برس کی عمر کے بعد دو تین سال کے لیے حالی کے اس محیطِ زندگی میں تھوڑا سا ہیجان ضرور پیدا ہو گیا تھا لیکن جوں ہی اینگلو عربک اسکول دہلی سے ان کا تعلق ہو گیا اور وہ دہلی میں سکونت پذیر ہوئے اس سمندر کا سارا مد و جزر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ حسنِ اتفاق سے اس کے بعد بھی ایسے موقع ملتے گئے کہ انھوں نے اپنی تمام زندگی خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ دنیا کے پُرفتن ہنگاموں سے دور رہ کر گزار دی۔ یہ ایک پُر عظمت زندگی تھی اور ہر پُر عظمت زندگی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ ڈرامائی ہو!

یہ وہ زندگی تھی جس پر ایک ایسا سکوت چھایا ہوا تھا جو صرف ان وقتی آلام و مصائب سے ٹوٹتا ہے جو ہر انسانی زندگی کے اجزاءِ لاینفک ہیں۔ کم عمری ہی میں ان کے والد اور والدہ کا سایہ اُن کے سر سے اُٹھ گیا۔ اور اسی طرح عہدِ شباب میں بھی ہندوستان کی اس "رستخیزِ بے جا" (۱۸۵۷ء) کے سبب اُن کی ملازمت بھی چھوٹ گئی لیکن انھوں نے مرزا غالب یا میر تقی میر کی طرح نعرہ ہائے دل خراش ہرگز نہیں بلند کیے اور نہ کبھی حادثات کا مقابلہ کرنے اور آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ قدرت نے بھی اُن کی اس سنجیدگی اور سیر چشمی کا اس طرح بدلہ دیا کہ وہ کبھی گوشہ نشین نہیں ہونے پائے بلکہ ہر دفعہ نت نئے طریقے سے اُن کی قدر و منزلت اور ترقی کے اسباب مہیّا ہوتے گئے۔ اور انھیں عزلت گزینی چھوڑ کر مختلف قسم کے ہنگاموں میں شریک ہونا پڑا۔

اُردو ادب پر حالی کی ابتدائی نظر

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ حالی کی سوانح عمری میں اندرونی دلچسپیوں کا بھی فقدان ہے، جو کاروباری اور علمی ہستیوں کے مقابلے میں ادبی شخصیتوں کے لیے ضروری قرار دی جاتی ہیں۔ جب شادی کے بعد اُن کا ذوقِ علم اُن کو دہلی لے گیا اور وہاں کی ادبی مجلسوں میں اُن کی آنکھیں کھلیں تو اُن کو ایک جہانِ دیگر نظر آیا جس میں ایک طرف تو غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، نیرؔ، شیفتہؔ، علویؔ، ممنونؔ اور صہبائیؔ وغیرہ کے ناموں سے شعر و سخن کا مذاق رکھنے والی مجلسیں ہمیشہ گرم رہا کرتی تھیں، اور

دوسری طرف مفتی صدرالدین، شاہ عبدالعزیز، فیض الحسن سہارنپوری، مفتی عنایت احمد، مولانا اسمٰعیل شہید، احمد رضا خاں صاحب بریلوی، محمد قاسم دیوبندی، احمد علی سہارنپوری، مولانا فضل حق خیر آبادی، سید احمد بریلوی، مولانا محمود الحسن، محمد فاروق صاحب چریاکوٹی۔ مولانا فضل الٰہی گنج مرادآبادی اور عنایت رسول صاحب چریاکوٹی جیسی مایۂ فخر و ناز شخصیتیں دینیات اور مختلف علوم و فنون کے اثرات اپنے ماحول پر بٹھائی جا رہی تھیں۔ اس کے علاوہ خود اُردو زبان اس وقت تک متفرق آبیاریوں کے باعث اس قابل بن گئی تھی کہ اس میں ادب و انشا کے علاوہ متفرق علوم و فنون کی کئی کتابیں لکھی جا چکی تھیں اور جن کی رفتار اس وقت بھی سرعت کے ساتھ روبہ ترقی تھی۔ اس قسم کے ماحول میں رہنے کے بعد ناممکن تھا کہ حالی وہ تمام سبق حاصل نہ کر لیتے جو روزمرہ کے تجربوں سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اور نیز یہ کہ ان کی ذہنیاتی داستان ویسی ہی پرسکون رہتی جیسا کہ ان کا بیرونی کردار تھا۔

حالی کی ذہنی نشو و نما

حالی ابھی پچیس برس کے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ وہ قیامت خیز واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ جس کے باعث ہندوستان کی تاریخ میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہوا۔ اس واقعے کے اثر سے دراصل کئی حساس ہستیوں کو ایک ایسا تازیانہ لگا جس کے بعد ان کے قدم ڈگمگائے بغیر نہ رہ سکے۔ اگرچہ حالی کی سنجیدہ طبیعت پر

ظاہری حیثیت سے اس کا کوئی نمایاں اثر نہیں ہوا لیکن یہی وہ واقعہ ہے جس نے ان کو ایک ایسے راستے پر ڈال دیا جس کے ذریعے سے وہ غیر ارادی طور پر ایک عظیم الشان منزل تک پہنچ سکتے تھے۔

۱۸۵۷ء سے پہلے حالی ضلع حصار کے محکمۂ کلکٹری میں ملازم تھے لیکن اسی پر آشوب زمانہ نے ان کی یہ جگہ چھڑا دی اور حالی کو کچھ دن پریشان رہنا پڑا۔ اس کے بعد جب پنجاب بک ڈپو کی ملازمت مل گئی تو اگرچہ وہاں کا ماحول ان کے لیے دلچسپ (بلکہ قابلِ برداشت) نہ تھا جس کی وجہ سے انھوں نے بعض الم ناک صدائیں بھی بلند کی ہیں لیکن یہی سنگِ بنیاد ہے اُس عظیم الشان ادبی عمارت کا جس کو حالی اپنی آخر عمر تک اٹھاتے رہے۔ لاہور بک ڈپو نے حالی کے لیے ایک ایسے دبستاں کا کام کیا جس کی خوشہ چینیوں کے باعث ان کی طرزِ تحریر اور ذوقِ ادب میں خاص طور پر اصلاح ہوئی۔ ہندوستانی انشا پردازوں کو راہِ راست پر لانے کا کام اگرچہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے قدر دانانِ اُردو نے بھی کیا تھا مگر اس بک ڈپو نے حالی کے ساتھ جو کام کیا وہ بالکل جداگانہ تھا۔ حالی کو یہاں مغربی زبانوں سے ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی اصلاح اور نظرِ ثانی کرنی پڑتی تھی اگرچہ ان کو مغرب کی کوئی ایک زبان بھی نہیں آتی تھی لیکن وہ خوش قسمت تھے کہ ان کو مغربی مذاقِ ادب اور طرزِ تحریر سے نہایت آسانی کے ساتھ آگاہی ہو گئی۔ اس بارے میں وہ اور ان کے ساتھ اردو ادبیات کرنل ہالرائڈ کے مرہونِ منت ہیں جن کی نگرانی میں حالی کی اس قسم کی قوتوں کی نشوونما ہوئی۔ خواجہ حالی اردو کے انشا پردازوں میں وہ سب سے پہلے شخص ہیں جو مغرب کے ان تمام اسرارِ سخن وری اور انشا پردازی

پر حاوی ہو گئے جن کے راز ہائے سربستہ بغیر مغربی زبانوں پر کافی دسترس حاصل کیے کبھی بے نقاب نہیں ہو سکتے !

پنک ڈپو کی ملازمت کی چار سالہ مدت اگرچہ خانگی حالات کے لحاظ سے حالی پر بہت شاق گزری لیکن اس عرصے میں اُن کے دماغ نے ایسے ایسے تخم حاصل کر لیے جس پر آگے چل کر نہایت ہی شاداب اور تناور درخت پیدا ہونے والے تھے !!

اینگلو عربک اسکول دہلی اور حالی کی ابتدائی نثری تصانیف

مغربی ادبیات کے ترجموں سے جس قسم کے نقوش یا تاثر حاصل کیے جا سکتے تھے ان تمام کو اپنے دل و دماغ پر ثبت کرنے کے بعد حالی اینگلو عربک اسکول دہلی میں منتقل ہوئے یہاں اگرچہ وہ زمانہ اور ماحول باقی نہیں رہا تھا جس میں اُن کے عہدِ شباب کی سرگرم گھڑیاں چند ہی سال قبل بسر ہو چکی تھیں۔ لیکن پھر بھی دہلی لاہور کے مقابلے میں حالی کے لیے پسندیدہ مقام تھا۔ چناں چہ یہاں آنے کے بعد جہاں ان کی خانگی پریشانیوں کا خاتمہ ہو گیا ان کی ذہنی ترقی بھی جو اب تک جاری تھی ایک خاص مرتبہ کو پہنچ گئی۔ جس کے بعد سے ان کی باضابطہ تحصیلِ علم و ادب گویا ختم ہو گئی۔

لاہور اور دہلی کی ملازمتوں کے زمانے میں حالی کی زندگی کن کن حالات سے ہو کر گزری ہے۔ ان کی تفصیل پیش کرنا ان کے سوانح نگار کا کام ہے۔

ہم اپنے اس مضمون میں اُن کی ہستی کے صرف اس پہلو کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں جو اردو نثر سے متعلق ہے۔ حالیؔ نے ابتداً اُردو نثر میں جو کچھ لکھا ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) **تریاقِ مسموم**: اس زمانے کے عام مذاق کے مطابق حالیؔ کی ذہنیت بھی اوّل اوّل مذہب کی طرف بہت راغب تھی چناں چہ طالب علمی ہی کے زمانے میں انیس بیس برس کی عمر ہی میں انھوں نے صدیق حسن خاں بہادر (جو مابعد نوابِ بھوپال ہوئے) کے کسی وہابیانہ مسئلے کی تائید میں ایک رسالہ عربی زبان میں لکھا تھا۔ تریاقِ مسموم انھوں نے اپنے ایک ہم وطن نو عیسائی عماد الدین کے اعتراضات کے جواب میں لکھی تھی۔ یہ کتاب ۱۹۶۸ء سے پہلے لکھی گئی تھی۔

(۲) حالی کی اُردو نثر کی دوسری کوشش **پادری عماد الدّین کی تاریخِ محمّدی پر منصفانہ رائے ہے** اس کتاب کا موضوع بھی جیسا کہ ظاہر ہے مذہبی ہے۔ یہ کتاب غالباً شائع نہیں ہوئی۔

(۳) **تیسرا کارنامہ مولود شریف ہے** یہ ۱۸۶۴ء کے درمیانی زمانے کی کوشش ہے۔ مولود شریف کا مبیّضہ حالیؔ کی وفات کے بعد اتفاق سے اُن کے خانگی کاغذات سے برآمد ہوا۔ جو شائع ہو چکا ہے۔ اس کی بعض عبارتوں کے نمونے ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں تاکہ حالیؔ کی ابتدائی نثر کی نوعیت اور اس کا اسلوب واضح ہو جائے اور نیز ان کے آخری زمانے کی طرزِ تحریر کے ساتھ اُس کو جو تعلق ہے اس کا بہ آسانی اندازہ کیا جا سکے۔

"الٰہی ہماری کیا مجال اور کیا تاب و طاقت۔ جو تیری نعمتوں کا شکر ادا کریں۔

تو قدیم، ہم حادث، تو خالق ہم مخلوق، تیری نعمتیں بے انتہا، ہماری ابتداء بھی فنا اور انتہا بھی فنا، اگر ہم نے زبان سے تیرا شکر ادا کیا، یا دل سے تیرا احسان مانا، یا بدن سے تیری خدمت بجالائے تو اس سے حقِ بندگی ادا نہیں ہوتا۔"

"اے امّتِ محمدؐ! یہ تم نہیں جانتے کہ یہ اختصاص تم کو کہاں سے ملا؟ اور کیوں ملا؟ یہ سب اس ذاتِ بابرکات کا طفیل ہے جس کی بدولت ایک تم کیا، تمام عالم نعمتِ وجود سے بہرہ مند ہوا۔ وہ جو آدم سے پہلے نبی تھا اور خلق کی ہدایت کو سب سے پیچھے بھیجا گیا جس کے امّتی ہونے کی موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر نے آرزو کی۔ جس کی نبوت میں ساری نبوتیں یوں محو ہو گئیں جیسے دھوپ میں ستارے۔ جس نے روزِ الست ربوبیت کا اقرار سب سے پہلے کیا، جس کا نامِ مبارک عرشِ مجید اور جنّت کے دروازوں پر لکھا گیا۔ جس پر ایمان لانے اور جس کی نصرت کرنے کا عہد انبیا سے لیا گیا۔" (صفحہ ۸)

بعض لوگوں نے بپاسِ ادب چاہا کہ آپ کو مسند پر بیٹھنے سے روکیں۔ عبد المطلب نے منع کیا اور کہا کہ یہ فرزندِ ارجمند کچھ نہ کچھ اپنی ذات میں شرف و بزرگی پاتا ہے جو یوں بے باکانہ دادا کی مسند پر آ بیٹھتا ہے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس کو کوئی مرتبۂ عالی ملنے والا ہے جو آج تک عرب میں کسی کو ملا ہے نہ ملے۔"

(۴) حالیؔ نے اسی زمانے میں طبقات الارض پر اردو میں ایک ترجمہ بھی کیا تھا۔ اصل کتاب فرانسیسی زبان میں تھی۔ جس کو مصر کے کسی عالم نے عربی میں منتقل کیا تھا۔ اسی ترجمے سے حالیؔ نے اس کو اردو کا لباس پہنایا۔

(۵) اس سلسلے کی آخری اور سب سے زیادہ اہم تصنیف مجالس النسّاء ہے۔

یہ کتاب اسی زمانے میں شائع ہو چکی تھی۔ اس کے سرِ ورق پر لکھا ہے کہ " جس کو الطاف حسین حالیؔ مدرس مدرسہ اینگلو عربی دہلی نے عورتوں کے لیے تصنیف کیا اور حسبِ جناب لفٹننٹ کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر مدارس ممالک پنجاب کے حکم سے لاہور کے سرکاری مطبع میں چھپی۔ ۱۸۸۳ء " یہ کتاب تعلیم نسوان سے متعلق ہے اس کے دو حصے ہیں اور دونوں حصے ملا کر چھوٹی تقطیع کے کوئی ڈیڑھ سو صفحات ہوتے ہیں۔ " اس کتاب کے صلے میں دربارِ دہلی کے موقع پر آپ کو گورنمنٹ کی جانب سے چار سو روپے کا اعزازی انعام بھی عطا ہوا جو لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھوں آپ کو ملا تھا۔ یہ کتاب غالباً پنجاب کے مدارس میں عرصے تک داخلِ نصاب بھی رہ چکی ہے "۔

مجالس النساؔ کئی وجوہ سے ایک اہم تصنیف ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ حالی کی اس قبیل کی پہلی اور آخری کوشش ہے۔ حالیؔ نے اس کے بعد کبھی فسانہ نویسی کی طرف توجہ نہیں کی۔ دوسرا قابلِ ذکر امر جس کا اظہار ہمارے اس مضمون سے خاص طور پر متعلق ہے اس کتاب کی طرزِ تحریر ہے اس کا ایک سرسری مطالعہ بھی اس امر کا یقین دلانے کے لیے کافی ہے کہ اس کا مصنّف ایک ایسا شخص ہے جو مغربی طرزِ تحریر سے اچھی طرح واقف ہے۔ چناں چہ اس کتاب کی ابتدا حسبِ ذیل مکالمے سے شروع ہوتی ہے جو نہایت اصلی اور سادہ ہے :

اتو جی ! آداب

برخوردار۔ بوڑھ سہاگن ! بیگم یہ تمھارے ساتھ اور کون ہیں ؟

ہیں اتو جی ! آپ نہیں جانتیں ؟ میری بھتیجی ہیں۔

اے کون ہیں ؟ مریم زمانی ؟

حضرت بندگی

بھلا بیٹا بہت سی عمر، میاں بچے بچے جیئیں۔ لو! تم کہاں ؟

جی، میں ابھی آکے اتری ہوں۔

آؤ بیٹی بیٹھ جاؤ۔ کہو مزاج تو اچھا ہے۔

حضرت خدا کا شکر ہے۔

بچے اچھے ہیں ؟

سب آپ کو دعا کہتے ہیں "

حالی کی یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس پر تفصیل کے ساتھ تنقیدی نظر ڈالی جائے اور کئی پہلوں سے اس کا مطالعہ کر کے نذیر احمد کی اسی قسم کی مصنّفات کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا جائے لیکن ہمارے اس مضمون کے حدود اس قدر وسیع نہیں ہیں اس لیے ہم ذیل میں اس کتاب کے چند اور اقتباسات پیش کرتے ہیں کہ اردو داں حضرات کو (جن میں سے بہت کم حالی کی اس تصنیف سے واقف ہیں) معلوم ہو جائے کہ انھوں نے نذیر احمد کی طرز میں بھی کس کامیابی کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ یہ کتاب اب بہت کم پائی جاتی ہے۔ لیکن ضروری ہے کہ اس کو دوبارہ شائع کیا، نیز نصابِ تعلیمی میں بھی (خصوصاً زنانہ مدارس کے) شامل کیا جائے۔

"کیا تم اس بات پر بھولی ہو کہ باپ کے گھر میں خدا کا دیا سب کچھ موجود ہے؟ واری ایسا خیال ہرگز نہ کرنا۔ بس خدا بُری گھڑی ہی نہ لائے۔ نہیں تو ایک دم کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ ہماری تو کیا بساط ہے جب بُرا وقت آتا ہے تو ملک کے وارث

ایک ایک روٹی کو محتاج ہو جاتے ہیں۔ خیر نادر گردی اور شاہ گردی کو تو ایک زمانہ گزرا۔ اسے جانے دو' یہ تو کل کی بات ہے کہ جب غلام قادر نے شاہ عالم کی آنکھیں نکالیں تو قلعہ اور شہر پر کیسی کیسی مصیبتیں پڑیں۔" (مجالس النسا حصۂ اول)

"لو بوا زبیدہ خاتون کا قصہ سن لیا۔ دیکھو اس کی ماں نے بیٹی کو پڑھا لکھا کر کیسا قابل کر دیا۔ کیا ہم آدمی نہیں ہیں' ہم چاہیں تو اس سے زیادہ اپنی اولاد کو آدمی بنالیں پر ویسی لیاقت کہاں سے لائیں۔

حضرت قصور معاف ہو تو کہوں' اس سے یہ کیوں کر نکلا کہ مائیں بیٹوں کو بھی پڑھا سکتی ہیں۔ ذکر تو میرے احمد مرزا پر چلا تھا' آپ اس پر زبیدہ خاتون کا قصہ لے بیٹھیں۔" (مجالس النسا حصہ دوم)

"غرض سید عباس نے دو مہینے کے بعد اسلام بیگ اور غلام امام اور خواجہ نزیل کو ہندوستان کی طرف چلتا کیا اور وہ زبیدہ خاتون کو دلی سے لے کر عرب چلے گئے' اول حج کیا پھر مدینہ شریف کی زیارت کی وہاں سے استنبول کا راستہ لیا' جب زبیدہ خاتون وہاں پہنچ گئی۔ چند روز کے بعد سید عباس کی شادی ایک بہت بڑے امیر کی بیٹی سے ہوئی سب نے دہلی کا رہنا اختیار کیا۔ بس یہ قصہ تمام ہوا۔ خدائے تعالیٰ ہر ایک کو ایسی ماں اور ہر ایک ماں کو ایسی اولاد عنایت کرے۔ آمین

(مجالس النسا حصہ دوم)

اردو ادب میں انقلاب

حالیؔ جس زمانے میں پیدا ہوئے اس سے ایک دو سال قبل ہی سے اردو نثر

میں انقلاب شروع ہو چکا تھا۔ چوں کہ وہ فارسی کی جگہ عدالتوں کی زبان بن گئی تھی، اس لیے قانون اور حکومت کی وہ تمام اصطلاحیں جو پہلے بالعموم فارسی تھیں اور اردو میں منتقل ہوتی جا رہی تھیں اس کے بعد ہی گورنمنٹ کو سرکاری مدارس کے لیے کتابیں تیار کرانی پڑیں جن کے موضوع مغربی طرز کے تھے۔ اسی سلسلے میں ۱۸۳۵ء میں جب اخباروں کو آزادی مل گئی تو دہلی سے کئی اخبار نکلنے لگے۔ ان تمام کا اثر یہ ہوا کہ اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی ذہنیتوں میں تبدیلی ہونے لگی جو ۱۸۵۷ء تک مسلسل ترقی کرتی گئی، لیکن اس کے بعد سر سیّد نے مغربی خیالات و حالات سے متاثر ہو کر قوم کی اصلاح و ترقی کا جھنڈا بلند کیا اور مخالفین و موافقین دونوں کو طرح طرح سے اپنی طرف متوجہ کیا۔ تو قومی اصلاحوں اور کامیابیوں کے ساتھ ہی ساتھ اردو زبان کی رفتار میں بھی خاص ہیجان پیدا ہو گیا۔ اور یہی وہ ہیجان ہے جو آج اردو کو ہندوستان کی جگت بھاشا بنانے میں سرگرم ہے۔

سر سیّد نے کئی طریقوں سے اردو کی خدمت کی، پہلے انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد ہر قسم کی علمی کتابوں کو مغربی زبانوں سے اردو میں منتقل کرنا تھا۔ اس کے بعد ایک اخبار نکالنا شروع کیا جو اس سوسائٹی کا ترجمان خیال کیا جاتا تھا۔ آخر میں انھوں نے وہ قابلِ یادگار کام کیا جو اردو ادبیات میں ہمیشہ ان کا نام زندہ رکھے گا۔ یہ کام ماہوار رسالہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت تھی۔ یہ وہ رسالہ ہے جس نے ہندوستان کے خوابیدہ علم و ادب کو اپنی غیر معمولی عیسیٰ نفسی سے زندہ کیا اور جس میں اردو کے عناصرِ خمسہ کی نشو و نما ہوئی۔ انھیں عناصرِ خمسہ میں سے ایک حالی بھی ہیں سر سیّد کے خیالات سے متاثر ہونے کے بعد حالی نے اردو نثر

ہیں جو کچھ لکھا ہے وہ اردو کے لیے مایۂ صد نازش و افتخار ہے۔

سرسید اور حالی دونوں میں تقلید کا رجحان بہت زیادہ تھا۔ شدتِ تقلید ہی تو تھی جس نے سرسیّد کو حد درجہ بدنام کر رکھا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ سرسید کی تقلید میں جدّت اور اختراعی قوت کے مظاہر بھی موجود تھے' اسی وجہ سے یہ بدنامی پائدار اثرات نہیں قائم کرسکی۔ یہی حال مولوی حالی کا ہے۔ وہ سرسید کی ہستی کو کئی لحاظ سے قابلِ تقلید سمجھتے تھے اور صرف یہی نہیں' وہ سرسیّد کے اس قدر گرویدہ تھے کہ ایک دو دفعہ علی الاعلان کہہ دیا کہ سرسید ہی وہ ہستی ہے جس نے مجھے اپنا لیا :

آں دل کہ رم نمودہ از خوبرو جواناں ؎ دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

سرسیّد کی طرزِ تحریر

سرسیّد کی نثر جدید خیالات کی اشاعت کا ایک زبردست آلہ تھا اس سے انھوں نے اس وقت کام لیا تھا جب کہ اردو زبان میں کوئی نثر (صحیح معنوں میں) موجود نہ تھی۔ ان کی طرزِ تحریر کی بعض خصوصیات ذیل میں اس لیے پیش کی جاتی ہیں کہ ان سے حالی کی طرزِ تحریر کا مقابلہ کیا جائے۔

(۱) وہ تصنّع اور الفاظ کی تراش خراش سے نفرت رکھتے تھے

(۲) وہ ان غلط لفظوں کو جو عام فہم ہوں اور خاص و عام کی زبان پر جاری ہوں' صحیح لفظوں پر ترجیح دیتے تھے۔ اس کے علاوہ دلّی کی بول چال پر بھی قانع نہ تھے۔

(۳) وہ الفاظ و قواعد کا محکوم رہنا پسند نہ کرتے تھے بلکہ الفاظ و قواعد کو اپنے جذبات و خیالات کا محکوم رکھتے تھے۔

(۴) تشبیہوں اور استعاروں سے زیادہ کام نہیں لیتے تھے۔ جو کچھ تشبیہیں اور استعارے ان کی عبارتوں میں ہیں سب برمحل اور بے ساختہ ہیں۔

(۵) وہ اکثر واقعات اور مناظر کی تصویریں ننگی کھینچا کرتے تھے۔

(۶) مختلف مضامین مثلاً علمی، مذہبی، اخلاقی، سیاسی، قانونی، ظریفانہ وغیرہ میں سے ہر ایک کو اسی پیرایے میں لکھتے تھے جو اس کے لیے بالکل مناسب ہو۔

سرسیّد اور حالی کی ذہنیتیں

سرسیّد اور حالی کی ذہنیتوں اور اُن کی نوعیت کا اس وقت صاف طور پر پتہ چل جاتا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ سرسیّد جس طرح اگرچہ تقلید کی طرف بہت جلد راغب ہو جاتے تھے لیکن کبھی اندھا دھند تقلید نہیں کرتے تھے، بالکل اسی طرز پر مولوی حالی بھی عمل پیرا رہے کہ اکثر اپنی ذاتی اپیچ سے کام لیتے ہیں۔

اگرچہ ان کی طرزِ انشا پردازی پر سرسیّد کا گہرا اثر پڑا لیکن ساتھ ہی انھوں نے اپنی شخصیت کو بھی برقرار رکھا۔ سرسیّد کے اسلوب سے وہی باتیں اخذ کیں جن کو وہ اچھی سمجھتے تھے۔ چناں چہ ان سے متاثر ہونے کے بعد حالی نے جو کچھ لکھا، اس کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ کرنل بالمرائڈ نے جس اعلیٰ مذاقی اور جدید طرزِ روش کو حالی سے روشناس کرایا تھا، اب اس میں کافی ترقی ہو گئی ہے اور ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ سرسید کے اسلوب میں جو جو نقائص باقی رہ گئے تھے ان کو حالی نے اپنے اسلوب میں بالکل دور کر دیا اور جو جو خوبیاں تھیں ان کو اور بھی چمکا دیا۔

حالی کی طرزِ تحریر

حالی کے متفرق مضامین، ان کا مقدمۂ شعر و شاعری، ان کی یادگارِ غالب اور حیاتِ سعدی کے مطالعے کے بعد ہم ان کے اسلوبِ بیان کی جو خصوصیات قائم کر سکتے ہیں وہ اس امر کی کافی شہادت دیتی ہیں کہ حالی کا اسلوب سرسید کی طرزِ تحریر کی ایک ترقی یافتہ، پختہ اور جامع شکل ہے۔ چناں چہ ان کی طرزِ تحریر کی بعض نمایاں خصوصیات یہ ہیں :

(۱) ان کی عبارتوں میں ظرافت، شوخی اور طعن و تشنیع بالکل نہیں، برخلاف اس کے وہ ہر بات کو سنجیدگی اور متانت سے ادا کرتے ہیں۔

(۲) ان کے کلام میں فارسی و عربی کے موٹے موٹے الفاظ اور اس قسم کی جدید ترکیبیں بہت کم ہیں، جو آج کل کے نوجوان انشا پردازوں میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔

(۳) وہ بازاری سوقیانہ اور مبتذل الفاظ استعمال نہیں کرتے۔

(۴) تشبیہوں، استعاروں اور تلمیحوں سے بہت کم کام لیتے ہیں۔

(۵) ان کی تحریر میں خود پرستی اور تعلّی نہیں پائی جاتی اور اگرچہ وہ خود کو کبھی بڑا عالم و ادیب ظاہر کرنا نہیں چاہتے لیکن اکثر جگہ ان کی اعلیٰ علمیت اور ادبیت ظاہر ہو جاتی ہے۔

(۶) وہ حتیّ الوسع اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اُن کی عبارت منطقی حدود سے باہر نہ ہونے پائے۔

حالی کی انفرادیت

ان خصوصیات کے معلوم کرنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ حاؔلی نے سرسیّد کی محض تقلید نہیں کی بلکہ اپنی ذات سے بھی اپنے اسلوب میں اس قدر قابلِ وقعت تبدیلیاں کیں کہ ان کا اسلوب اس زمانے کی اُردو نثر اور اس کی نوعیت کا ایک بہترین نمونہ بن گیا۔
ان ہی متذکرۂ بالا خصوصیات میں سے بعض ایسی بھی ہیں جن کی وجہ سے حاؔلی کی عبارتیں عوام میں خاص طور پر مقبول نہ ہو سکیں۔ اور اگر اس بارے میں وہ سرسیّد کی بعینہٖ تقلید کرتے تو بہت ممکن تھا کہ ان کی نثر زیادہ عام پسند ہو جاتی۔ لیکن حاؔلی کی خود دار انفرادیت نے اس امر کو ہرگز گوارا نہیں کیا کہ وہ سرسیّد احمد خاں کے اسلوب کی اس خصوصیت کو بھی اختیار کر لیتے جو ان کی نظر میں سنجیدگی اور علمی وقار کے خلاف تھی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے سرسیّد اور حاؔلی کے اسالیب میں امتیازی شان جلوہ گر ہونے لگتی ہے۔

حاؔلی کی نثر کیوں عام طور پر مقبول نہیں ہوئی

عام اردو داں مولوی حاؔلی کی عبارتوں کو اس لیے خشک سمجھتے ہیں اور پسند

نہیں کرتے کہ :

(۱) ان میں ایشیا کے (اور بالخصوص اس زمانے کے) عام مذاق کے مطابق یورپ والوں اور جدید خیالات پر طعن و تشنیع نہیں کی جاتی۔ نیز مخالفوں پر اعتراضات کے علاوہ اُن کے جملوں کے سخت سے سخت جوابات نہیں دیے جاتے۔

(۲) اُن میں شوخی ظرافت اور رنگینی نہیں پائی جاتی۔ بلکہ سنجیدگی اور متانت پڑھنے والے کو گراں گزرنے لگتی ہے۔

(۳) اُن میں نئی نئی اور عجیب و غریب ترکیبیں عربی و فارسی کے مرکّب الفاظ، اور رنگا رنگ تشبیہیں اور استعارے بہت کم نظر آتے ہیں۔ حالاں کہ یہی چیزیں سطح آشنا نظروں پر اثر ڈالنے کے لیے نہایت ضروری ہیں۔

(۴) اُن میں استدلالی پہلو بہت زیادہ ہوتا ہے، شاعری اور عبارت آرائی نہیں ہوتی۔

ذیل میں حالی کی بعض ان عبارتوں کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں جو سرسیّد سے متاثر ہونے کے بعد لکھی گئی تھیں اور جن میں متذکّرہٗ بالا خصوصیات کی جھلک بہت دکھائی دیتی ہیں :

(۱) "جس قدر ہم کو اس بات کا یقین ہے کہ عالم موجود ہے اُسی قدر ہم کو اس بات کا بھی یقین ہے کہ ہم سب کام اپنے اختیار سے کرتے ہیں۔ اور جیسا ہم کو پہلے یقین میں ایک نہایت ضعیف احتمال اس بات کا رہتا ہے کہ شاید یہ تمام نمائش عالمِ خواب کی سی نمائش ہو، ویسا ہی ایک ضعیف احتمال اس بات کا رہتا ہے کہ شاید ہمارے یہ سب افعال و حرکات ایسے ہوں جیسے قطب نما کی سوئی کی حرکت۔

لیکن ایسے ضعیف احتمالات سے یقین زائل نہیں ہو سکتا۔" (مضمون تدبیر)

(۲) "شیخ کے کلام سے جا بجا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیشتر بے سر و سامانی اور متوکل درویشوں کی طرح سفر کرتا رہا ہے، اور بعض موقعوں پر اس کو حالاتِ سفر میں نہایت سخت تکلیفیں اور ایذائیں پہنچی ہیں۔" (حیاتِ سعدی)

(۳) "مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ ان سے مل آتا تھا اس کو ہمیشہ اُن سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے اور اُن کی خوشی سے خوش اور اُن کے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ اس لیے ان کے دوست ہر ملت و مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے۔" (یادگارِ غالب)

(۴) "رہی دوسری بات سو اس کا تو ہمارے شعرا نے کبھی بھول کر خیال نہیں کیا جو باتیں بے شرمی کی ہوتی ہیں وہاں اور بھی پھسل پڑتے ہیں اور نہایت فخر کے ساتھ ناگفتنی باتوں کو کھلّم کھلّا بیان کرتے ہیں۔" (مقدمۂ شعر و شاعری)

حالی کی انشا پردازی کے نقائص

ان اقتباسات کے ملاحظے کے بعد جہاں ہمیں حالی کی متانت اور پختہ کارانہ تحریر کا ثبوت ملتا ہے۔ وہیں اُن کے اسلوب کی ایک دو خصوصیات نقائص کی شکل میں بھی دکھائی دینے لگتی ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ ان کے اسلوب کی

ایک دو خصوصیات نقائص معلوم ہونے لگتی ہے اور اکثر جگہ ادبی شان باقی نہیں رہتی، اگر چہ ایک زمانے میں جب کہ اردو میں ہر طرف رنگین اور پر تکلف عبارتیں لکھنے کا عام شوق اور مذاق پھیلا ہوا ہے۔ اس قسم کا ردِّ عمل ضروری تھا اور اس حیثیت سے حالی کی یہ کوشش ضرور قابلِ قدر ہیں لیکن وہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک اعلیٰ انشا پردازی کا زندہ نمونہ ہرگز نہیں بن سکتیں۔ انشا پردازی کا دارومدار خود حالی کے خیال کے مطابق صرف خیالات پر نہیں بلکہ الفاظ پر بھی ہے۔ چناں چہ اسی امر پر انھوں نے اپنے مقدمۂ دیوان (یعنی شعر و شاعری) میں زیادہ بحث کی ہے، اور بعض جگہ حدِ اعتدال سے بھی متجاوز ہو گئے ہیں۔

انتباسات میں دوسری چیز جو کھٹکنے لگتی ہے وہ انگریزی طرزِ بیان کی تقلید ہے۔ پہلے بھی یہ ذکر گزر چکا ہے کہ سرسید کی طرح حالی بھی تقلید کی طرف زیادہ راغب تھے اور ان دونوں کی تقلیدیں اندھا دھند نہیں ہوتی تھیں۔ تاہم حالی نے اس انگریزی کی تقلید کی خاطر ایک ایسی یادگار چھوڑی ہے جو کسی وقت بھی پڑھنے والے پر اثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی اور وہ حیاتِ سعدی میں سعدی کو "ان" اور "ان کی" کے بجائے "وہ" اور "اس کی" کا استعمال ہے یہ اردو دانوں کے لیے ایک نئی بلکہ معیوب چیز ہے۔ حالی جب غالب اور سرسید کی زندگی کے واقعات لکھنے بیٹھتے ہیں تو آپ اُن کا استعمال کرتے ہیں، لیکن جب سعدی کا حال لکھتے ہیں "جن کی عظمت کسی حیثیت سے ان دونوں سے کم نہ تھی" تو وہ اُس اور اُس کا استعمال کرتے ہیں یہ وہ برائی ہے جو حیاتِ سعدی کا مطالعہ کرتے وقت اکثر جگہ پڑھنے والے کے ذہن کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔

حالی کی تحریروں کا ایک اور نقص جو اقتباسات بالا میں ظاہر نہیں ہوتا انگریزی الفاظ کا بے دھڑک استعمال ہے، وہ اُردو کو ہندوستان کی عام زبان بنانے کے لیے ضروری سمجھتے تھے کہ اس میں متفرق زبانوں کے الفاظ اور ترکیبیں فیاضی کے ساتھ استعمال کی جائیں اور اس خیال پر وہ اس حد تک کاربند ہو گئے تھے کہ بعض بعض مقامات پر انگریزی کے ایسے ایسے نامانوس الفاظ استعمال کر دیے ہیں جن کا مفہوم اردو الفاظ کے ذریعے آسانی سے ادا کیا جا سکتا تھا۔ اس قسم کے بعض الفاظ ملاحظہ ہوں:

ایفیلیٹس، گریجویٹس، امیجینیشن، ورک، کریچیانٹی، بیاگرافی، لیڈنگ آرٹیکل، سویلیزیشن، ریمارکس، لٹریری پوائنٹ، سرکل، لائف۔

حالی کی نثر اور حیاتِ جاوید

علمی اور ادبی لحاظ سے حیاتِ جاوید حالی کا زبردست شاہکار ہے چوں کہ یہ اُن کی آخر عمر کی پیداوار ہے اس لیے ان کی مخصوص طرزِ انشا کی جس قدر مکمل ترجمانی اس کتاب سے ہوتی ہے ان کی کسی اور تصنیف سے نہیں ہوتی، حیاتِ جاوید اور حالی کی دیگر مصنّفات کے اسلوب میں کچھ فرق ضرور نمایاں نظر آتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حیاتِ جاوید کے اکثر جملے بہ نسبت حیاتِ سعدی اور یادگارِ غالب کے جملوں کے زیادہ طویل ہیں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سرسیّد کے سوانح لکھتے وقت چوں کہ ان کو ایک مختصر کتاب کے ذریعے بہت زیادہ مطالب کو

پیش کرنا مقصود تھا اس لیے بڑے بڑے مرکب جملے لکھنے پڑے، مثلاً حسب ذیل جملوں سے ظاہر ہو جائے گا کہ وہ کس طرح کئی کئی مطالب ایک دو جملوں ہی میں ادا کر جاتے ہیں:

"دوسرے آرٹیکل میں جس کا عنوان "ورنیکلر یعنی ہماری زبان" ہے انھوں نے اول ان مشکلات کو بیان کیا ہے۔ جو مغربی علوم کو دیسی زبانوں میں ترجمہ کر کے شائع کرنے میں پیش آتی ہیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا کلکتے میں ایک سوسائٹی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لیے قائم کرنا، پھر دہلی کالج میں بہت سی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہونا اور پھر اسی مقصد کے لیے سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کا قائم ہونا اور تینوں جگہ ناکامی کے سوا کوئی نتیجہ حاصل نہ ہونا نہایت عمدگی سے ظاہر کیا ہے"۔

"سب سے بڑا فائدہ جو اس مجلس کے انعقاد سے ہوا وہ یہ تھا کہ ہر سال مسلمانوں کی ایک جماعتِ کثیر جس کی تعداد بعض اجلاسوں میں ہزار ہزار سے متجاوز ہوگئی نہ کسی سیر اور تماشے کی غرض سے، کسی حاکم کے حکم سے اور نہ کسی ذاتی منفعت کے لیے بلکہ محض اس خیال سے کہ جو مجمع قوم کی بھلائی کے ارادے سے ہوتا ہے اس میں شریک ہوں دور دراز سفر کی تکلیف اور آمد و رفت کا خرچ برداشت کر کے کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ قومی معاملات پر گفتگو کرتے تھے، ہنستے تھے، بولتے تھے، انجانوں میں تعارف پیدا ہوتا تھا۔ دوستوں میں خلوص بڑھتا تھا اور اس طرح ایک مردہ قوم کے اجزا میں روز بروز التیام پیدا ہو جاتا تھا۔"

"ان کا ارادہ سر ولیم میور کی چاروں جلدوں کا جواب لکھنے کا تھا جس

میں صرف ایک جلد لکھنے پائے تھے کہ ولایت میں ٹھہرنا نا ممکن ہو گیا اور ہندوستان میں پہنچ کر کچھ تو اس وجہ سے کہ یہاں آکر وہ کالج کی فکر میں مصروف ہو گئے اور زیادہ تر اس سبب سے کہ جو کتابیں لندن میں بہ آسانی میسّر آ سکتی تھیں ان کا ہندوستان میں کہیں وجود نہ تھا۔ وہ ارادہ پورا نہ ہو سکا مگر مباحث سر ولیم میور کی کتاب میں زیادہ اہم ہے ان میں سے چند کے سوا سب تفصیلی یا اجمالی جواب اس ایک جلد میں آگیا ہے۔" (حیاتِ جاوید طبع دوم۔ صفحہ ۲۳۸)

مولوی حالی کے اسلوب کی یہ خصوصیت کہ وہ بے حد سنجیدہ رہتی ہیں حیاتِ جاوید میں ایک زبردست نقص کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ حالی نے ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ماحول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لیکن وہ اس قدر سنجیدہ انسان تھے کہ جب سر سیّد کو اس "رستخیزِ بے جا" کے درمیان پیش کرتے ہیں تو اس متانت اور بے پروائی کے ساتھ عبارت آرائی کرتے ہیں کہ گویا یہ ایک بالکل معمولی واقعہ ہے حالاں کہ یہ ایک ایسا مقام تھا جہاں ایک زبردست ادیب کے سمندِ جذبات پر ضرور تازیانے لگتے ہیں اور جس کے اثر سے اس کا دماغ یقیناً محشرِ خیالات بن سکتا ہے۔ چناں چہ سر سیّد اور ان کے علاوہ غالب، آزاد اور نذیر احمد وغیرہ جن جن انشا پردازوں نے بھی اس "رستخیزِ بے جا" کا ذکر کیا ہے۔ وہ سب اپنا متاثر ہونا پوشیدہ نہ کر سکے، ایک زبردست ادیب کا اہم ترین فرض یہ بھی ہے کہ وہ جس واقعے سے متاثر ہو اس کی تصویر اس قدر جاذب اور پرجوش کھینچ دے کہ دیکھنے والے پر اس کا گہرا اثر ہو حیاتِ جاوید کا مِیر اباب تیسواں سید اور غدر کی حالت کا اظہار کیا ہے)

شروع سے آخر تک پڑھ جائیے کہیں اس امر کا پتہ نہیں چلتا، کہ لکھنے والے نے متاثر ہو کر لکھا ہے۔

اسی طرح سرسیّد (حیاتِ جاوید کے ہیرو) کی وفات کا جہاں حال لکھا ہے جوش و جذبات کو بالکل طاق میں رکھ دیا ہے، ورنہ یہ ایک ایسا مقالہ تھا جہاں انھیں اپنی سنجیدگی کا نقاب دور کر کے ضرور قلبی کیفیت ظاہر کر دینی چاہیے تھی۔

حالی کی شخصیت اُن کی تصنیفات میں

اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے کہ ہر انشا پرداز کی شخصیت اس کی تحریروں میں کبھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتی تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حالی کی شخصیت کی جھلکیں بھی اُن کی تحریروں میں کہیں نہ کہیں ضرور نمایاں ہو جایا کرتی ہیں، ان میں سب سے زیادہ حصّہ ان کی متانت اور سنجیدگی کا ہے۔ حالی کی متانت مقتضی تھی کہ محفل میں بیٹھ کر واہ واکہنا بھی کجا آہ بھی نہیں کھینچنا چاہیے۔ جس قدر آزاد کی شخصیت ان کی تحریروں میں پھٹی پڑتی ہے اتنی ہی حالی کی طبیعت چھپی رہتی ہے۔ وہ کبھی ظاہر ہونا نہیں چاہتے مگر باوجود اس کے بعض موقعوں پر وہ ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ اس بارے میں وہ اردو کے لارڈ میکالے ہیں۔ کیوں کہ آزاد کارلائل کی طرح اپنے جوش و جذبے سے مجبور ہو کر ہر وقت ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ حالی بھی میکالے کی طرح سنجیدگی اور خودداری قائم رکھنے کا التزام کرتے ہیں اور جس طرح میکالے کی تحریروں میں ذاتی معتقدات و امیال کی جھلک نمودار ہوئے بغیر نہیں

رہ سکتی۔ حالؔی کی عبارتیں بھی کہیں نہ کہیں اپنے مصنّف کی قلبی گہرائیوں اور دماغی کیفیتوں کا پتہ دے جاتی ہیں۔ اُس کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) ایک جگہ وہ تہذیب الاخلاق کی غیر معمولی کامیابی اور اس کے اسباب بیان کرتے ہوئے اپنی طرزِ تحریر کی ایک بڑی خصوصیت پر خاص زور دیتے ہیں یعنی یہ کہ "اس تہذیب الاخلاق میں مخالفوں کے اعتراضات کے جواب نہایت سخت ضرورت کے سوا کبھی نہ دیے جاتے تھے۔ اور اس لیے مناظرے کے لیے بے مزہ ردوبدل اور جواب اور ردِّ جواب دکدّ جواب وحلّہ جواب کے ناگوار تسلسل سے وہ بالکل پاک تھا۔"

(۲) حیاتِ جاوید میں ایک اور جگہ انھوں نے اپنی فطری سنجیدگی، بے تعصّبی اور سلیم الطبعی کا غیر ارادی طور پر اظہار کیا ہے اُن کا خیال ہے کہ اردو ہندوستان کی جگت بھاشا بن کر رہے گی، اور ہندوؤں کی مخالفت آخر کار ناکام ثابت ہوگی اس ذاتی رائے کے اظہار کے لیے انھوں نے سرسیّد کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا ہے کہ ہم کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ "جس تعلیم نے ہمارے ہندو نوجوانوں سے تعصّب اور نفرت کرنا سکھایا ہے، وہی آگے چل کر ان کو سبق دے گی کہ جب تک ہندو مسلمان مل جل کر نہ رہیں گے اور ایک دوسرے کے مصالح کو ملحوظ نہ رکھیں گے تب تک برٹش انڈیا میں اصلی عزّت حاصل نہیں کر سکتے۔ اس موقع پر اس خاص واقعے کا لحاظ رہے کہ سرسیّد کے خلاف مولوی حالؔی نے اس رائے کا اظہار کیا ہے۔ سرسیّد کو یقین تھا کہ "اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔"

حالی نے خود سر سیّد کے الفاظ میں اس امر کا اظہار کیا ہے کہ "انھیں دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا۔ اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ . . . . . میں نے کہا اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔"

اس عبارت اور حالی کی ذاتی عبارت (جو اوپر پیش کی گئی ہے) کا مقابلہ کرنے کے بعد صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس موقع پر حالی اپنی شخصیت کو چھپا نہ سکے اور اپنے ہیرو کے خیالات کے خلاف اپنی رائے غیر ارادی طور پر پیش کر دی۔ واقعہ ہے کہ سنجیدہ سے سنجیدہ مصنّف بھی اپنی تحریر میں اپنی شخصیّت کو ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(۲) اس کتاب کے دوسرے حصّے میں ایک جگہ حالی کی شخصیّت بے دھڑک طریقے پر ظاہر ہو گئی ہے۔ اور یہ بات اس قدر اہم ہے کہ اسی پر ان کی پوری کتاب حیات جاوید کی اہمیت کا انحصار ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مذہبی اصلاح کے خیال کو سر سیّد کی ترقی کا اہم ترین سبب ثابت کرنے میں انھوں نے اپنی ذاتی معتقدات کے مطابق عمل کرتے ہوئے ایک زبردست اور اصولی غلطی کی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ سر سیّد نے ہندوستان کے مسلمانوں کی فلاح و بہبودی

کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انھوں نے اسلام کی بالراست کوئی خدمت کی ہے یا اسلام نے (بحیثیت مذہب) اُن کو شاہراہِ ترقی پر گامزن ہونے کے لیے مجبور کیا تھا۔ ایک ایسا شخص جس کی نظر میں جنت اور دوزخ کی کوئی حقیقت نہیں، جس کے پاس شیطان اور جن کا کوئی خیال نہیں جو معجزے کا قائل نہیں اور جس کے نزدیک اسلام ایک فلسفیانہ مذہب ہے۔ یہ دقت تمام مذہب کی خاطر اس قدر رجان جوکھوں کے کام کر سکتا ہے دنیا کے اکثر بڑے بڑے فاتح اور عظیم الشان ہستیاں وہی گزری ہیں جنھیں مذہب کی مادی جزا و سزا پر اعتقاد کامل تھا اور جو فرشتوں اور حوروں کو مرتے دم اپنی آنکھوں سے خوش آمدید کہتے ہوئے دیکھتی تھیں۔

یہ تعجب انگیز نظر آتا ہے کہ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے مذہب کو دیکھنے والا ایک شخص جو یہ جانتا ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کی اصلاح و راستی کی کوئی ضرورت نہیں اور جو بذاتِ خود جامع و مانع ہے، اس کی خرابیوں کو دور کرنے اور اس کی خوبیوں کو نمایاں کرنے کے لیے اس قدر سخت کوشش کرے! اگر سر سید کے ماحول کو دیکھا جائے تو اس امر کا ثبوت بہ آسانی بہم پہنچ سکتا ہے کہ اس زمانے میں اسلام کی بحیثیت مذہب نہایت اچھی حالت تھی۔ اور مسلمان خاص طور پر دینداری کی طرف مائل تھے۔ چناں چہ خود حالی نے لکھا ہے۔

دارالخلافہ کا آخیر دور تھا اور مسلمانوں کی آخرت کی امید دلانے کے سوا جن کا اسلام وعدہ کرتا تھا کوئی امید دنیا میں باقی نہ رہی تھی۔ اس لیے وہ مذہب کو زیادہ مضبوط پکڑے جاتے تھے، خصوصاً شریف اور ممتاز خاندانوں میں مذہبی فرائض کی پابندی

اور مذہبی باتوں کا چرچا بہت زیادہ تھا۔" (حیاتِ جاوید)

جب خود مسلمان اس شدت سے مذہب پر عمل پیرا تھے تو پھر سرسیّد کو اسلام کی طرف متوجہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ حالی نے (چوں کہ خود نہایت دیندار اور متقی تھے) اس موقع پر ارادی یا غیر ارادی طور پر غلطی کی، اور اس امر کو اس شدومد سے لکھا کہ یہی حصّہ اسلوب بیان کی حیثیت سے اُن کی کتاب کا شہ پارہ بن گیا ہے۔

سرسیّد کو اسلام کا درد نہیں اکسا رہا تھا بلکہ مسلمانوں کی ردّی حالت اور یہ ردّی حالت دینی نہیں تھی بلکہ دنیاوی، مسلمان دنیا داری میں بہت پیچھے رہ گئے تھے اور اسی میں ان کو راہِ راست پر لانا سرسیّد کا عین مقصد تھا۔ اس مقصد کا تعلق بالراست مذہب سے نہیں بلکہ قومیت سے ہے۔ مولوی حالی کا خیال کہ ہندوستانی قومیت کے خیال سے پہلے نا آشنا تھا اس لیے سرسیّد کو اب کس طرح اس کا خیال پیدا ہو سکتا ہے اور اگر پیدا ہو بھی تو کس طرح اس قدر پیدا ہو کہ بڑے بڑے کام دکھاتا ہے، بالکل سطحی معلوم ہوتا ہے۔ سرسیّد میں اگر قومیت کا خیال پکے جوش و خروش کے ساتھ پیدا ہو گیا تو کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔ وہ زمانہ اور ماحول ہی ایسا تھا کہ کسی دردمند اور بلند حوصلہ شخص کو اس قسم کا خیال ضرور پیدا ہو جاتا کہ یہ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ "جس طرح حالتِ موجودہ میں یہ ممکن نہیں کہ یورپ کے موجدوں اور مخترعوں کے حالات سن سن کر ہندوستان میں بھی ویسے ہی موجد اور مخترع پیدا ہونے لگیں، اسی طرح یہ بھی امکان سے خارج ہے کہ یورپ کے رفارمروں اور وطن دوستوں

کے حالات کتابوں میں پڑھ کر یا نہ پائی سن کر ہندوستان میں بھی ویسے ہی ملک کے جاں نثار اور قوم کے مصلح پیدا ہو جائیں۔ کبھی کوئی بڑے کام دوسرے بڑے کاموں کی نظیر یا مثال سے نہیں کیے جاتے۔ اور کوئی بڑا شخص دوسری قوموں کے بڑے شخصوں کے حالات سن کر بڑا نہیں بنتا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے جہاں کہیں کسی ملک و قوم کو کسی بات کی ضرورت ہوتی ہے تو خواہ وہ کیسی ہی اجنبی اور نئی ہو وہ اس کو لامحالہ کر بیٹھتے ہیں، اور کرنے سے پہلے ان کو یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ ہم کیا کرنے والے ہیں، تاریخِ عالم میں اس کی سیکڑوں مثالیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اگر کوئی شخص سر سیّد کی لائف اور ان کی تصنیفات سے واقف ہونے کے بعد اس متذکرہ مسئلے پر نظر ڈالے تو اس کو صاف طور پر واضح ہو جائے گا کہ سر سید نے اپنا مطمحِ نظر قوم کو بنایا ہے نہ کہ مذہب کو۔ ہم اس وقت اس مسئلے کو طول دینا نہیں چاہتے۔ یہاں صرف اس امر کا اظہار مقصود تھا کہ حالی کی شخصیت کس طرح ان کی تصنیفات میں ظاہر ہو جایا کرتی ہے؟

وہ متعلقہ واقعات کا ذکر کر جاتے ہیں اور اپنا نام ظاہر نہیں کرتے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اگرچہ ممکن ہے کہ نئی روش پر چلنے والا شاعر کوئی مضمون زمانے کی ضرورت اور مقتضائے حال کے موافق شعر کے لباس میں جلوہ گر کر کے ملک کے جدّت پسند لوگوں میں کچھ مقبولیت یا شہرت حاصل کرے اور ایک خاص حیثیت سے اس کے کلام کی داد توقّع سے زیادہ اس کو مل جائے مگر شاعرانہ حیثیت سے نہ تو فی الواقع وہ اس کے کلام کی داد ہوتی ہے اور نہ وہ اس کو داد سمجھتا ہے۔ بلکہ ایسی داد سُن کر چپکے ہی چپکے اپنے دل میں یہ شعر

پڑھتا ہے :

بخون آلودہ دست و تیغ غازی ماندہ بے تحسیں
تو اکنوں زیب اسپ و زینت برگستواں بینی

شعرائے ہم عصر کچھ قدیم ذوقِ شعری کے تعصّب سے اور زیادہ تر اجنبیت اور بے گانگی مذاق کے سبب اس روش کو اس حجّت سے کہ وہ شارعِ عام سے الگ ہے تسلیم نہیں کرتے اور بعض اپنے نزدیک اس کی ہجوِ ملیح اس طرح فرماتے ہیں کہ فلاں شخص نے شاعری نہیں کی بلکہ مفید اور اخلاقی مضامین لکھ کر اپنے لیے زادِ آخرت جمع کیا ہے۔ لیکن اگر وہ فی الواقع موجودہ نسل کی قدر شناسی سے قطعِ نظر کر چکا ہے تو اس کو ایسی باتوں کی کچھ پروا نہ کرنی چاہیے۔ جب کہ یہ اُمید رکھنی چاہیے کہ قوم کی زمین میں کچھ آل باقی ہے تو تخم اکارت نہ جائے گا۔

(مقدّمۂ شعر و شاعری)

واقعہ ہے کہ خود حالی کے اس شعر کے مطابق کہ :

سُنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا
یہی ایک دن کام کر جائے گی

آخر کار اردو شاعری کی کایا پلٹ ہو گئی اور ان کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ کیا اس متذکرۂ بالا اقتباس سے صاف طور پر ظاہر نہیں ہوتا کہ اس میں حالی نے خود اپنی طرف اشارہ کیا لیکن بہت ممکن ہے کہ وہ غیر ارادی طور پر یہ لکھ گئے ہوں۔

حالیؔ کی مصنّفات میں ان کی بے لوثی

حیاتِ جاوید' یادگارِ غالب اور مقدّمۂ شعروشاعری میں اکثر ایسے مقامات بھی تھے جہاں حالیؔ اپنی ذات کے متعلق بہت کچھ شرح وبسط کے ساتھ لکھ سکتے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فطرت میں تعلّی نام کو نہ تھی وہ پہلے تو اپنا ذکر کرنے سے حتّی الوسع پرہیز کرتے تھے لیکن جہاں کہیں اس پر مجبور ہو جاتے ہیں تو اس خاکساری سے اپنا ذکر کرتے ہیں کہ اُن کی شخصیت کی ایک خاص عظمت نمودار ہونے لگتی ہے' مثلاً یادگارِ غالب میں جہاں مرزا کی نثرِ اُردو پر ریویو کیا ہے۔ میر مہدی مجروحؔ کے متعلق خط میں انھوں نے نہایت عاجزی اور صداقت کے ساتھ اپنے متعلق لوگوں کے خیالات کی تردید کی ہے۔ (یادگارِ غالب)

اُردو کے بڑے بڑے ثقہ اور سنجیدہ انشاپردازوں کی مصنّفات میں بھی اس قسم (یعنی تعلّی اور خودنمائی) کے عیوب پائے جاتے ہیں' آزاد کی اکثر تحریروں میں اس کی جھلک نمایاں ہے۔ خدا رکھے نواب حیدر یار جنگ طباطبائی کی شرحِ دیوانِ غالب اور تلخیص عروض و قافیہ ایسی مثالوں سے خاص طور پر مالا مال ہیں۔ علامہ شبلی جیسا مہتم بالشّان انشاپرداز بھی اس عیب سے بچ نہ سکا۔ شعرالعجم حصّۂ اول میں جہاں رودکی کا بیان ہے مولانا نے اس کے مشہور قصیدے کا ذکر کیا ہے۔ جس کا پہلا شعر ہے :

لوٹے جوٹے مولیاں آیا ہمی   یاد یار مہرباں آید ہمی

اور اس کی شرح میں جہاں امیر معزی کے قصیدے کا ذکر کیا ہے ان کو اپنا بھی ایک قصیدہ یاد آگیا ہے۔ جو سر آسمان جاہ بہادر وزیر اعظم دکن کی علی گڑھ میں تشریف آوری کے متعلق لکھا گیا تھا۔

حالی کو اپنی مصنفات میں اپنی نظموں اور ذاتیات کے پیش کرنے کا کئی جگہ موقع حاصل تھا۔ لیکن اُن کی فطری بے لوثی نے انھیں اس کی اجازت نہیں دی اس کی بعض مثالیں ذیل میں پیش کی ہیں۔

(۱) مقدمۂ شعر و شاعری میں جہاں انھوں نے گولڈ سمتھ کی شاعری کی شرح کے تحت اس کی ایک نظم کا اظہار کیا ہے' وہ اپنی اس نظم کو پیش کر سکتے تھے جو شعر کو مخاطب کر کے (گولڈ اسمتھ کی اسی نظم کے ترجمے کے طور پر) لکھی گئی تھی نیز اسی کتاب میں ان کی وہ نظمیں بھی کہیں نہ کہیں درج ہو سکتی تھیں جو دلی کی شاعری کے تنزل کے عنوان سے لکھی گئی تھیں۔

(۲) حیاتِ جاوید اور یادگارِ غالب میں حالی کو کافی موقع تھا کہ وہ سر سید اور غالب کے ساتھ اپنی خانگی تعلقات کے متعلق ایک عنوان قائم کر لیتے۔ یا کم از کم کسی دوسرے عنوان کے ضمن میں ان کا ذکر کر دیتے۔

(۳) حالی نے مرزا غالب کا جو عالی شان اور دردناک مرثیہ لکھا تھا وہ یادگارِ غالب میں غالب کی وفات کے ذکر کے ساتھ درج کیا جا سکتا تھا۔ نیز انھوں نے غالب کی جو تاریخِ وفات لکھی تھی اس کا ذکر بھی اس موقع پر بے جا نہ تھا۔

(۴) حیاتِ جاوید میں جگہ جگہ (متن میں یا حاشیوں پر) اس قدر موقع حاصل تھا کہ وہ اپنی ان تمام نظموں کو داخل کر سکتے تھے جو انھوں نے موقع بموقع سرسید اور اُن کے کاموں کے متعلق لکھی تھیں۔ اگرچہ انھوں نے دوسروں کی اس قسم کی نظمیں درج کی ہیں لیکن کہیں اپنی کوئی نظم نہیں پیش کی۔ ان کی جو نظمیں حیاتِ جاوید میں کسی نہ کسی جگہ درج ہو سکتی تھیں اُن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ قصیدۂ ناتمام۔ مرقومۂ ۱۲۹۴ھ سرسید احمد خاں کی شان میں۔

(۲) قصیدہ مرتبہ ۱۳۰۹ھ جو حیدر آباد میں محمڈن کالج ڈیپوٹیشن کی طرف سے پڑھا گیا تھا (دیوانِ حالی)

۳۔ قطعہ۔ مرتبہ ۱۳۰۹ھ جو حیدر آباد میں محمڈن کالج ڈیپوٹیشن کی طرف سے پڑھا گیا تھا۔ (دیوانِ حالی ۱۴۸)

۴۔ ترکیب بند۔ مرتبہ ۱۳۰۹ھ جو ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں پڑھا گیا تھا۔ (دیوانِ حالی صفحہ ۱۵)

۵۔ تاریخ بنائے چاہ درحوالۂ مدرستہ العلوم مسلمانان علی گڑھ بحسن سعی جناب آنریبل سرسیّد احمد خاں بہادر (دیوانِ حالی صفحہ ۱۸۴)

۶۔ ترکیب بند۔ مرتبہ ۱۳۲۰ھ جو ایجوکیشنل کانفرنس دہلی میں پڑھا گیا (دیوانِ حالی صفحہ ۱۶۴)

۷۔ سرسیّد احمد خاں کی تکفیر (دیوانِ حالی صفحہ ۱۷)

۸۔ سرسیّد احمد خاں کی مخالفت کی وجہ (دیوانِ حالی صفحہ ۱۹)

۹۔ سرسیّد احمد خاں کی تصانیف کی تردید (دیوانِ حالی صفحہ ۲۳)

۱۰۔ علی گڑھ کالج کیا سکھاتا ہے۔ (کلیات نظم حالی جلد اوّل صفحہ ۵۰)

اُردو نثر میں حالی کا درجہ

حالی کی نثری خدمات پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جس طرح عام طور پر ان کو شاعر کی حیثیت سے اہمیت دی جاتی ہے اور ایک دبستانِ سخن کا بانی قرار دیا جاتا ہے نثر کے لحاظ سے بھی ان کی مصنّفات ادبیاتِ اُردو کے کا جزوِ لاینفک جو اُن کی شاعری کی طرح ادبیاتِ اُردو میں ایک نئے اور ضروری باب کے اضافہ کا باعث ہیں اس وقت بھی جب کہ اُردو کا سرمایۂ نثر کافی ترقی کر چکا ہے اگر مولوی حالی کی نثری خدمات کو اس سے علاحدہ کر لیا جائے تو ایک ایسا فقدان نظر آئے گا جس کی تلافی شاید ہی متعدد انشاپردازوں کی متفقہ کوششوں کے بعد بھی ایک عرصے تک ہو سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ حالی کی نثری تصانیف ادبیاتِ اردو کی بساط کے ایسے پیوند ہیں جن کے بغیر اس کی بدنمائی ہرگز نہیں چھپ سکتی۔

اگرچہ اردو نثر میں سب سے پہلے جدید طرز کی علمی و ادبی کتابیں لکھنے کا سہرا مولوی محمد حسین آزاد کے سر ہے۔ لیکن ان کا اسلوبِ بیان کچھ اس قسم کا ہے کہ وہ معیاری اُردو کی کتابیں نہیں قرار دی جا سکتیں۔ آزاد اپنی تحریروں میں اس قدر بے تکلّف ہو جاتے ہیں کہ ہر جگہ اپنی ذات کے متعلق کچھ نہ کچھ کہے بغیر نہیں رہ سکتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حسّاس شخص خانگی

ملاقات میں بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ یہی حال نذیر احمد کا ہے، وہ اس معاملے میں ایک طرح سے آزاد سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ آزاد کی عبارتیں پڑھتے وقت یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی شخص گھر میں بیٹھ کر بے تکلف گفتگو کر رہا ہے۔ حالی نے اپنے اسلوب بیان کے ذریعے ان دونوں زبردست خرابیوں کو دور کر دیا اور سنجیدہ و علمی مضامین کو اس طرح لکھنا شروع کیا کہ پڑھنے والا ان سے مرعوب ہو جائے اور اس کو معلوم ہو کہ یہ ایک علمی بحث ہے۔ اس قسم کے اسلوب کی اس زمانے میں سخت ضرورت تھی۔ کیوں کہ یہ ردِّ عمل تھا۔ اردو کی ان پرانی طرز کی تحریروں کا جن میں مواد اور کام کی باتیں تو بہت کم ہوتی تھیں لیکن لفظی خوبیوں اور ظاہری صناعیوں کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا تھا۔ یہ حالی جیسے سنجیدہ اور اعلیٰ مذاق رکھنے والی ہستی ہی کا کام تھا کہ جہاں اردو کو ایک طرف بے جا جکڑ بندیوں سے نکالنے کی کوشش کی تو دوسری طرف اس امر کا بھی لحاظ رکھا کہ وہ بالکل آزاد ہو کر بازاری اور مبتذل نہ ہونے پائے۔

اسلوب کی خوبیوں کے علاوہ حالی کی نثری مصنفات نوعیت موضوع و مضامین کے لحاظ سے ان کے ہم عصروں میں ان کو ممتاز رکھتی ہیں یہ پہلے ادیب ہیں جنھوں نے تنقیدی خیالات کو اردو میں روشناس کیا۔ حالی سے قبل اردو کے کسی انشا پرداز نے بھی اس طرح غیر جانب دارانہ تنقید پیش نہیں کی تھیں۔ اگرچہ آزاد نے آبِ حیات میں اس فرض کو انجام دینا چاہا ہے، لیکن ان کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ غیر جانب دار نہیں رہ سکتے، وہ جگہ جگہ اپنے ذاتی معتقدات سے کام لیتے ہیں اور اس بات پر غور

کرنے کی کوشش نہیں کرتے کہ میں کس کے ساتھ انصاف کر رہا ہوں اور کس کے حق میں ظلم ؟ مولوی نذیر احمد تو اس میدان کے مرد ہی نہیں۔ برخلاف ان دونوں کے حالی کو قدرت کی جانب سے ایک تنقیدی دماغ عطا ہوا تھا۔ اگرچہ انھوں نے فنِ تنقید پر کچھ نہیں لکھا لیکن وہ انشا پردازوں کا بالمقابلہ مطالعہ کرنے میں خاص طور پر اعلیٰ مذاق سے کام لیتے تھے۔ غیر جانب دار تنقیدی خیالات کی جس قدر فراوانی اُن کی تحریروں میں پائی جاتی ہے اس زمانے کے کسی اور انشا پرداز کی مصنّفات میں نہیں پائی جاتی، یہی ایک زبردست امتیاز ہے جس کے باعث حالی نے اردو ادب میں ایک اہم رتبہ حاصل کر لیا ہے۔ اور جس کے اثر سے آج تک اُردو کے تنقید نگاروں کی خاص رہبری ہوتی رہی ہے۔

اردو شعرا نے جہاں حالی کی نئی طرز کی نظموں کو آنے والی شاعری کے صحیح نمونے سمجھ کر اُن کی تقلید کرنی شروع کی اُن کے دیوان کے دیباچے، مقدمے کے مطالعے کے بعد یہ معلوم کیا کہ یہ نمونے کیا اہمیت رکھتے ہیں اور ہم کو ان کی تقلید کس طرح کرنی چاہیے ؟ اگرچہ حالی کی نظمیں ملک و قوم کے ساتھ ان کے نثری مقدّمے اور دیباچے کے بغیر پیش ہوتیں تو اُن کا اثر اُردو کے شاعروں پر اس قدر دیرپا نہ ہوتا۔

حالی نے نہ صرف نمونے پیش کر دیے، بلکہ ان نمونوں کو آنے والی نسلوں کے لیے چراغِ راہ بنانے کی خاطر اُن کی خوبیوں، ضرورت اور اصولوں پر بھی روشنی ڈال دی، اس میں کوئی شک نہیں کہ مولوی محمد حسین آزاد نے بھی اس قسم

کے نمونے ضرور پیش کیے ہیں، اس میں اوّلیت کا فخر انھیں کو حاصل ہے اور ان کی بعض نظمیں حالی کی بعض نظموں سے یقیناً بلند پایہ قرار دی جاسکتی ہیں لیکن وہ اتنی مقبول نہ ہوسکیں جتنی حالؔی کی نظمیں ہوئی ہیں۔ حالؔی نے ایک اعلیٰ وارفع مقام پر پہنچ کر عام روش کے خلاف صرف ایک زوردار اور انوکھی آواز بلند کی ہے بلکہ آواز سن کر ان کی طرف متوجہ ہونے والوں کے لیے اپنے نقشِ قدم بھی چھوڑ دیتے ہیں جن پر چلنے کے بعد ہر شخص اس اعلیٰ مقام تک پہنچ سکتا ہے جہاں سے حالؔی نے صدا دی تھی۔

تنقید نگاری کے بعد حالی کا زبردست نثری کارنامہ ان کی سوانح عمریاں ہیں۔ جس طرح اردو تنقید نگاروں میں ان کو اوّلیت کا رتبہ حاصل ہے سوانح عمریوں کو روشناس کرانے میں بھی حالؔی سب سے پیش پیش ہیں، فن سوانح نگاری اگرچہ مشرق کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے، لیکن حالی سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے یورپ کی جدید ترین طرزِ سوانح نگاری کے مطابق ہندوستان میں بیٹھ کر سوانح عمریاں لکھنی شروع کیں۔ مورّخانہ تدقیق، حالات اور واقعات سے منطقی طور پر نتیجوں کا استخراج اور جس کی سوانح عمری لکھی جائے اس کے کارناموں اور زندگی میں غور و خوض کرنے کی ابتدا حالؔی ہی نے کی اور ان کے بعد اردو کے جس قدر انشا پردازوں نے سوانح نگاری کی طرف توجہ کی ان سب کو غیر ارادی طور پر حالؔی ہی کی تقلید کرنی پڑی۔ اس بارے میں علامہ شبلؔی جیسی ہستی بھی حالؔی کی خوشہ چیں نظر آتی ہے۔ اگرچہ شبلؔی کا دائرۂ عمل، اسلوبِ بیان اور نوعیتِ مضامین دونوں لحاظ سے حالؔی کے جولان گاہ سے بہت زیادہ دلچسپ اور وسیع تھا۔

لیکن جب انھوں نے سوانح نگاری کی طرف توجہ کی تو انھیں بھی حالی کے پیش کردہ اصولوں کو اختیار کرنا پڑا۔ یہ حالی کی صحتِ مذاق کی دلیل ہے کہ شبلی جیسا بلند پایہ شخص بھی انھیں کے اصول پر کاربند ہوتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں اردو نثر میں حالی کی اہمیت ایک خاص انفرادی شان کے ساتھ جلوہ گر ہونے لگتی ہے۔

حالی دنیا کی ان خوش قسمت ہستیوں میں سے تھے جو اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پودے کو اپنی آنکھوں سے پروان چڑھتا ہوا دیکھ کر فخر حاصل کر سکتے ہیں۔ انھوں نے جس قدیم پیرایۂ تحریر کا ردِّ عمل شروع کیا تھا۔ وہ ان کی زندگی ہی میں حرفِ غلط بن کر مٹ چکا تھا۔ ان کی نئے رنگ کی نظموں نے انھیں کے سامنے پرانے اور بد وضع رنگوں کی شاعری کو اپنے وسیع دامنوں میں محو کر لیا۔ ان کے ثقہ اور سنجیدہ تنقیدی خیالات نے ایک طرف تو قدیم بے راہ روی اور بد مذاقی کے خرمنوں کو بجلی بن کر جلا دیا اور دوسری طرف بوستانِ علم و ادب کے نونہالوں کو ابرِ نیساں بن کر سرسبز و شاداب بنا دیا۔

اس کامگار انسان کی مسرت و اطمینان کی کوئی حد بھی ہو سکتی ہے جس نے اپنی جوانی میں جن کاموں کے کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا ان کو اپنے بڑھاپے تک فتح مندی کے ساتھ انجام کو پہنچا دیا ہو!!

اپنے فرائض سے سبک دوش ہونے اور اپنی امیدوں کو بار آور پانے کے بعد اگر حالی کو وہ اطمینان و سکون نصیب نہ ہوتا جو اُن کی آخر عمر میں انھیں حاصل ہوا تھا اور جس کے بعد انھوں نے کوئی بڑا ادبی کام نہیں پیش کیا ہوتا تو فطرت کی اس سے بڑھ کر احسان فراموشی اور نا قدر دانی کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔

مولانا رومی اور علامہ اقبال

اُردو زبان میں مولانائے روم کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوششیں کوئی چار سو سال سے کی جارہی ہیں۔ سب سے پہلے دکن کے شاعروں نے ان کے بیان کیے ہوئے تمثیلی قصوں کو طویل مثنویوں کی شکل میں منظوم کیا ہے۔ گجرات کے مشہور اردو شاعر شیخ خوب محمد چشتی کی مثنوی "خوب ترنگ" ان ہی کے انداز میں قلم بند کی گئی ہے اور اس میں مثال کے طور پر ویسے ہی دلچسپ مقامی اور دیسی قصّے لکھے ہیں جیسے مولانائے روم نے اپنی مثنوی میں جگہ جگہ اپنے افکار و تصوّرات کی وضاحت کے لیے بیان کیے تھے۔ مثنوی خوب ترنگ آج سے چار سو سال قبل ۹۸۶ھ میں بمقام احمد آباد لکھی گئی تھی۔ اس کے بعد بیجاپور اور گولکنڈہ کے شاعروں نے بھی اپنی مذہبی مثنویوں میں مولانا رومی کے اتباع کی کوشش کی ہے۔ ۱۲۹۴ھ میں شاہ متجان مدراسی نے مثنوی رومی کے جملہ ساتوں دفاتر کا اُردو ترجمہ مثنوی ہی کی شکل میں کیا تھا جو بعد میں ۱۹۰۰ء میں مطبع کریمی بمبئی سے کئی جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ لیکن یہ صرف ان منتخب حصّوں کا ہے جن کو مدراس کے ان بزرگ شاعر نے اپنے ذوق کے مطابق چن لیا تھا۔

اردو… ان میں مثنوی رومی کی کئی شرحیں بھی لکھی گئی ہیں جن میں سے بعض

کئی کئی جلدوں میں چھپ بھی چکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ رومی کو سمجھنے اور سمجھانے کی یہ تمام کوششیں اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ اردو والوں پر فارسی کے اس حکیم شاعر کا کتنا اثر تھا اور مثنوی معنوی کس قدر و منزلت سے دیکھی اور پڑھی جاتی تھی۔ مگر رومی کے ان تمام قدر دانوں اور شیدائیوں میں کوئی شاعر یا ادیب اس معیار تک نہیں پہنچ سکا تھا جو رومی کے اعلیٰ تصوّرِ عرفان اور فلسفیانہ مسائل کی اسی شاعرانہ انداز میں تشریح و توضیح کر سکتا جو مولانا روم کا حق تھا۔

یہ کام گویا علاّمہ اقبال کی قسمت میں لکھا تھا۔ فطرت کی جانب سے ان میں وہی سوز اور تڑپ ودیعت کی گئی تھی جو رومی کو غالباً شمس تبریزی کے فیضِ نظر سے حاصل ہوئی تھی۔ علاّمہ اقبال کے اس فطری رجحان کو ان کی تعلیم و تربیت اور خاص کر یوروپی فلسفیوں کے مطالعے اور تحقیق و جستجو نے اور قوی بنا دیا تھا۔ اس تعلیمی نشو و نما اور ذہنی ارتقا کے بعد جب وہ اس شعر کی حقیقت سمجھنے کی طرف رجوع ہوئے کہ

مثنوئ مولوئ معنوی :. ہست قرآں در زبانِ پہلوی

تو انھیں محسوس ہوا کہ زبانِ پہلوی میں قرآن کے مطالب و معانی کو فلسفہ و عرفاں کے رنگ میں سمجھانے کا جس عمدہ پیرائے میں رومی نے اہتمام کیا ہے اسی طرح انھیں اردو زبان میں کرنا چاہیے۔ پھر اس معنی میں وہ صرف اردو زبان تک محدود نہیں رہے بلکہ انھوں نے تنگنائے اردو سے نکل کر فارسی زبان کا سہارا ڈھونڈا۔ لیکن جو کچھ انھوں نے رومی کے رنگ میں لکھا خواہ وہ اردو میں ہو یا فارسی میں، اس وجہ سے بہت اہم ہے کہ وہ بعض مقامات اور منازل

میں رومی سے آگے بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ رومی جس سماج اور ماحول کے پرداختہ تھے اور جس سماج اور ماحول کو مخاطب کر رہے تھے وہ اقبال کے عہد میں تقویم پارینہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا اور ایک لحاظ سے تو دقیانوسی بن چکا تھا اقبال کو ایک ایسے زمانے سے سابقہ تھا جو یورپ کی سامراجیت کو اپنے انتہائی عروج پر دیکھ رہا تھا اور دوسری طرف مارکس اور لینن کے نظریات کی روشنی روز بروز عام ہو رہی تھی۔ ایک تہذیب دم توڑ رہی تھی اور دوسری تہذیب کا آفتاب طلوع ہونے لگا تھا۔ انقلاب کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں اور آزادیٔ اقوام کے تصوّر اور عملی اقدام کے چرچے جگہ جگہ شروع ہو چکے تھے۔

اقبال نے رومی کے جیسے کشف سے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ سیاہ فام افریقی قومیں ایک روز اقصائے عالم کی قسمتوں کے فیصلے کی مالک بنیں گی۔ اور تہذیبِ مغرب ایک نہ ایک دن اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ لے گی۔ ایک ایسے موڑ پر کھڑے ہو کر انھوں نے اپنے بلند تخیّل اور سحر آفریں آواز سے بالکل اسی طرح کام لیا جس طرح رومی نے اپنے زمانے میں لیا تھا۔ رومی نے عجم کی فلسفہ پرستی اور مادّیت نوازی کا جس انداز میں علاج ڈھونڈا تھا اقبال نے اسی انداز میں اپنے دور کی انقلاب آفریں اور لادینی مزاج کا مداوا معلوم کرنے کی سعی کی۔

ایک طرف تو انھوں نے مشرق اور اقوام مشرق کی بیداری کے گیت گائے اور دوسری طرف مشرقی اقوام میں مسلمان ان کو سب سے زیادہ پسماندہ نظر آئے تو انھوں نے ان کو جگانے اور جھنجھوڑنے کے لیے تلخ نوائی سے بھی کام لیا۔

اس وقت صوفی خانقاہوں میں مست تھے اور بے خودی کے دامن ہی کو گوشۂ عافیت اور متاعِ استغنا سمجھتے تھے۔ اقبال سب سے پہلے انھیں کولتاڑتے اور انھیں جگانے کی طرف متوجہ ہوئے اور خانقاہیت کے خلاف آواز بلند کی۔ خواجہ حسن نظامی پہلے صوفی تھے جنھوں نے اقبال کو سمجھا اور ان کے تصورِ تصوف کی تعمیر میں حصّہ لیا۔

علاّمہ اقبال نے خودی کو زندہ کرنے اور اس کو تمام مقاصد دینی و دنیوی کا آلۂ کار بنانے کی تبلیغ شروع کی۔ صوفی یہ سمجھتے تھے کہ خودی کو ترک کرنے ہی سے خدا ملتا ہے۔ اس لیے :

یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

جیسے تصورات کے تحت ان کی خانقاہوں میں سماع اور ان کے فقرا میں بھنگ اور چرس کی عادتیں جاری و ساری ہو گئی تھیں۔ رہبانیت جس کی اسلام نے ممانعت کی تھی ان صوفیوں نے اپنے انداز میں جائز کر رکھی تھی اور اس کے جواز کے لیے رومی اور ابنِ عربی کے اقوال و اشعار کی تاویلیں کرنے لگے تھے۔ اقبال نے ان سب کو بے نقاب کیا اور کہا :

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں — بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست

فقیہہِ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور — کہ معرکے ہیں شریعت سے جنگ دست بدست

گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی — اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

یہ تو ذرا نرم آواز ہے۔ اقبال نے تو یہاں تک للکارا :

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

پھر مردِ مومن کا اقبال نے ایک اعلیٰ تصور پیش کیا اور سمجھایا:

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اسی خیال کو انھوں نے اپنی ایک نظم میں اس طرح وضاحت سے بیان کیا ہے:-

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان

قدرت کے مقاصد کے عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

بالِ جبریل میں ایک طویل نظم ایسی بھی ہے جس میں انھوں نے خود کو مریدِ ہندی اور مولانا رومی کو اپنا پیر و مرشد ظاہر کیا ہے اور ان کو "امامِ عاشقانِ دردمند" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ اس نظم میں اپنے اور اپنے دور کے شکوک و شبہات پیش کرکے رومی سے ان کے جواب مانگے ہیں، جو حسنِ اتفاق سے اقبال کو مثنویِ مولوی معنوی ہی سے مل گئے ہیں۔ یہ ایک دلچسپ اور سبق آموز مکالمہ ہے۔ ایک جگہ علامہ سوال کرتے ہیں:

دورِ حاضر مستِ جنگ و بے سرور
بے ثبات و بے یقین و بے حضور

کیا خبر اس کو کہ ہے یہ راز کیا
دوست کیا ہے دوست کی آواز کیا

آہ یورپ بافروغ و تابناک
نغمہ اس کو کھینچتا ہے سوئے خاک

اس کا جواب مولانا رومی نے دیا:

ہر سماعِ راست ہر کس چیز نیست　　　طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست

پھر اقبال پوچھتے ہیں :

پڑھ لیے میں نے علوم شرق و غرب　　　روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

رومی جواب دیتے ہیں کہ :

دستِ ہر نااہل بیمارت کند　　　سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

غرض اقبال اسی طرح مختلف سوالات کرتے ہیں کہ اہلِ مشرق یورپ والوں سے کیوں مسحور ہیں ؟ کالجوں کے طالب علم ساحرِ فرنگ کے چنگل میں کیوں پھنسے ہوئے ہیں ؟ مغربی عورتیں حورِ جنت سے کیوں زیادہ حسین نظر آتی ہیں ؟ آدم کا بھید اور غایتِ آدم کیا ہے ؟ قومیں کس بیماری سے مرتی ہیں ؟ جبر و قدر کا مسئلہ کیا ہے ؟ سینے میں دل کس طرح بیدار ہوتا ہے ؟ آب و گِل کیوں کر قابو میں آتے ہیں ؟ قیامت پر یقین کیوں نہیں آتا وغیرہ وغیرہ ۔

اس نظم میں اقبال رومی کو جگہ جگہ ایسے القاب و آداب سے مخاطب کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کے خاص معتقد اور گرویدہ تھے ۔ کہیں وہ مولانا کو شریکِ مستی خاصانِ بدر کہتے ہیں اور کہیں لکھتے ہیں کہ :

تجھ پہ روشن ہے ضمیرِ کائنات

وہ ایک جگہ سوال کرتے ہیں کہ آج کل کا تقاضا ہے :

انجمن سازی اور جلوہ آرائی ــــــ اور

اور بے خلوت نہیں سوزِ سخن

تو رومی جواب دیتے ہیں کہ :

خلوتِ از اغیار باید نے زِ یار
پوستیں بہر دے آمد نے بہار

آخر میں پوچھتے ہیں کہ :

ہند میں اب نور باقی ہے نہ سوز
اہلِ دل اس دیس میں ہیں تیرہ روز

تو رومی جواب دیتے ہیں :

کارِ مرداں روشنی و گرمی است
کارِ دوناں حیلہ و بے شرمی است

اس تمام نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال رومی کو دورِ حاضر کے مسائل کے لیے بھی ایک دانائے راز اور طبیبِ حاذق سمجھتے تھے۔ مگر جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے بعض منازل و مواقع پر انھوں نے رومی کے خیالات میں مزید اضافہ کیا ہے ایسے ہی مواقع پر ان کی انفرادیت اور خاص شخصیّت کا احساس ہوتا ہے اور خود اقبال ہی کا یہ شعر یاد آتا ہے :

سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

نہ معلوم اقبال جیسا دانائے راز پھر کب پیدا ہو !

●●

اقبال کا اثر اردو شاعری پر

اقبال نے تخیل کی جولانیوں کے لیے ایسے ایسے میدان کھول دیے ہیں جن کی طرف اس سے قبل اردو شاعروں کی توجہ کبھی منعطف ہی نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے خیالی اور مصنوعی شاعری کو نظروں سے گرا دیا۔ اردو شاعروں کا فرضی معشوق دہن کمر کی طرح اب خود بھی عنقا ہوتا جا رہا ہے۔ مصنوعی عشق بازی اور جھوٹی معاملہ بندی اب ہماری شاعری کی جان نہیں رہی۔ قصیدوں کی مبالغہ آمیزیاں اور مثنویوں کے فوق الفطری قصّے جنوں اور پریوں کی طرح آہستہ آہستہ غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ اقبال نے لفظی چٹکلوں اور دور از کار محاورہ بندیوں کی جگہ حقائق کی تلخیوں اور سیاسیاتِ حاضرہ کے ناگفتہ بہ مسائل کو اس خوبی سے شاعری میں داخل کر دیا ہے کہ اب اردو شاعری کے موضوع ہی بدل گئے اور شاعری واقعی ساحری بن گئی اقبال نے صاف صاف اعلان کر دیا:

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہِ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بے گانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

بے گانے تو ناخوش رہتے ہی ہیں لیکن اقبال سے اپنوں کا خفا ہونا بھی

ضروری تھا کیوں کہ انھوں نے غالب کی طرح قدیم ڈگر کو چھوڑ کر نئی روش اختیار کی اور خیالی معاشقے یا فرضی بادہ و ساغر کے بیانات سے اپنے کلام کو آلودہ نہیں کیا۔

وہ کہتے ہیں:

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

ایک اور جگہ لکھا ہے:

عزیز تر ہے متاعِ امیر و سلطان سے
وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز و براقی
میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے وہ بھی حرام اے ساقی

اقبال پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے لوازمِ غزل کی پابندی نہیں کی اور ایسے نامانوس اور خشک مضامین باندھے جن کی ہماری شاعری متحمل نہیں ہوسکتی۔ اس کے علاوہ زبان و محاورے کا بھی خیال نہیں رکھا۔ اس کا جواب خود اقبال نے اپنی مختلف نظموں میں اس طرح دیا ہے:

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی
مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی
کہ بانگِ صورِ سرافیل دل نواز نہیں
مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر
خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

غرض اقبال نے شاعری کا اسلوب ہی بدل دیا۔ آزادہ روی حقیقت نگاری شاعری کے لوازم ہوتے جا رہے ہیں، معاملہ بندی آسمان یا معشوق کے ظلم و ستم کا ماتم، رقیبِ روسیاہ کے رشک و حسد کا گلہ، غزل کی زبان کا لحاظ، دلّی یا لکھنؤ کے محاوروں یا روزمروں کی پابندی غرض طرح طرح کی قید و بند سے ہماری شاعری آزاد ہوتی جا رہی ہے۔ مولوی حالی نے پھر بھی قدیم مشرقی مروّت سے کام لیا تھا اور شعرائے نازک خیال کے تکلّفاتِ لایعنی اور خیالی لوازمِ شعری کی مدافعت اس مہذّب پیرائے میں کی تھی:

اہلِ معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

لیکن اقبال ضروریاتِ زمانہ کے پیشِ نظر سخن آرائی کے قائل نہیں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اسی سخن آرائی کے لحاظ نے حد سے زیادہ ہمارے شاعروں کو گمراہ کر کے معانی و مطالب کی گہرائیوں سے بے پروا کر دیا اور اردو شاعری یا تو قافیہ پیمائی یا محاورہ بندی کے لیے وقف ہو گئی یا چند موضوعوں کے لیے محدود کر دی گئی۔ اقبال اسلوب سے زیادہ مطالب و معانی کے قائل ہیں۔ وہ اس نظریے کی تبلیغ کرتے ہیں کہ اگر خیال اچھا ہے تو اس کو پیرایۂ بیان بھی خود بخود

اچھا ہی مل جائے گا۔ اور بغیر مشاطگی یا پروپگنڈے کے اس کے سننے اور سمجھنے والے بھی پیدا ہو جائیں گے۔

ایک جگہ وہ کہتے ہیں:

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر!

دوسرے شعرا کی طرح اقبال اپنے کلام کو جام مئے بنا کر گردش میں لانا نہیں چاہتے۔ بلکہ وہ اہلِ محفل کو دعوتِ عمل دیتے ہیں کہ اس ثمر سے وہ خود مئے لالہ فام نکالیں۔ اور جو اس دعوت پر لبیک کہنا نہیں چاہتے اور ذوقِ خودی نہیں رکھتے اُن سے تو وہ مخاطب بھی نہیں ہیں۔ ان کا شعر ہے:

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغ اصیل

یہی وجہ ہے کہ ابھی تک ہندوستان کی محفل ان کے کلام کو سمجھنے اور اس سے کما حقّہٗ محظوظ ہونے کے قابل نہیں ہوئی۔ ان کا تخیّل دور نکل گیا ہے اور ان کے ساتھی بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس کا خود ان کو بھی احساس ہے وہ کہتے ہیں:

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

شعرا تو کجا اہلِ مدرسہ و اہلِ خانقاہ بھی اس ذوق سے بے بہرہ نظر آتے ہیں

اور اسی محرومی کی وجہ سے اب تک ملک و قوم کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اقبال کا شعر ہے:

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

اس خیال کو ایک اور جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے:

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو
میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

ان کے خیال میں اضطراب و اثر اور خونِ جگر کے بغیر سخن بے فیض ہے اور شاعر ساحر نہیں بن سکتا:

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اقبال نے ہمارے شاعروں کے سب سے بڑے نقص یعنی اظہارِ بوالہوسی اور زلف و کاکل، خدوخال اور جوبن و کمر کے مضامین باندھنے کی اچھی توضیح کی ہے:

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

یہ مصرعہ کہ "آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار" جتنا اُردو کے شاعروں اور خاص کر غزل گو شعرا پر صادق آتا ہے۔ دنیا کے کسی اور فن کار پر منطبق نہیں ہوتا۔

عشق عاشقی اور معاملہ بندی کی جگہ اقبال چاہتے ہیں کہ ہمارے شاعر حقیقت نگاری سے آشنا ہوں اور اپنی خودی کی حفاظت کریں۔ جب تک آدمیوں اور شاعروں میں یہ احساس پیدا نہ ہوگا کوئی شاعری ملک و قوم کے لیے وجہِ حیات اور باعثِ وقار ثابت نہیں ہو سکتی۔

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک اُمتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

جو کلام حقیقت پر مبنی نہ ہو اور زندگی کے سبق نہ سکھلائے وہ بے کار ہے۔ وہ بادِ سحر ہی کیا جس کے جھونکے چمن کی افسردگی کو شگفتگی میں

نہ بدل سکیں۔ اقبال کہتے ہیں :

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے، لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

اسی خیال کو ایک اور نظم میں اس طرح واضح کیا ہے :

ہے شعرِ عجم گرچہ طربناک و دل آویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہے گلستاں
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز
اقبال یہ ہے خارہ تراشی کا زمانہ
از ہر چہ بآئینہ نمایند بہ پرہیز

آخر میں ہم اقبال کی اس نظم کے چند شعر بھی سنا دیتے ہیں جو ہمارے نوجوان شاعروں کے لیے لائحۂ عمل کا کام دے رہے ہیں۔ اور جن میں اقبال شاعر ہی سے مخاطب ہیں :

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاجِ نفس نے
شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے

تاثیرِ غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کے مانند ہو تیزی میں تری مے
ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

یہ ہے وہ وسعتِ نظر اور مرحلۂ شوق کی گوناگونی جو اردو شاعری کو متاثر کر رہی ہے۔ اقبال کی تلخ نوائیوں نے نہ صرف نوجوانوں بلکہ تسکین و سیماب اور جوش و ساغر جیسے پختہ مشق شاعروں کو بھی متاثر کر دیا۔ اقبال کے اثر سے رفتہ رفتہ قدیم طرز کی شاعری متروک ہوتی جا رہی ہے۔ ایک زمانے میں ناسخ و آتش کے اثر سے الفاظ و محاورات اور اسالیبِ بیان متروک ہو گئے تھے۔ اور آج اقبال کے اثر سے بہت فرسودہ خیالات لایعنی تکلفات اور غیر ضروری لوازمِ شعر متروک ہوتے جا رہے ہیں اور جہاں تک مطالب و معانی کا تعلق ہے اردو شاعری اقبال کے کلام سے متاثر رہے گی اور اہلِ اردو میں زندگی اور زندہ دلی قائم رکھنے کا باعث ہوگی۔

حضرت امجدؔ حیدرآبادی

حکیم الشعرا حضرت امجدؔ علیہ الرحمہ موسیٰ ندی کے کنارے محلّہ چمپادروازہ کی ایک گلی میں چار محل کے نشیب کے قریب ایک غریب ماں کے بطن سے پیدا ہوئے اور وہیں کے شریف الخاندان بچوں میں پرورش پائی اور انہی کے ساتھ مدرسہ نظامیہ میں تعلیم کے لیے داخل ہوئے۔ یہ مدرسہ بھی اس زمانے میں چمپادروازے کے راستے سے شہر میں داخل ہونے والی گزرگاہ کے قریب ایک مسجد سے متّصل واقع تھا۔ یہ چھوٹی سی مسجد تو اب بھی موجود ہے۔ مگر وہ گھر جس میں حضرت امجد پیدا ہوئے تھے اور وہ گلیاں جن میں ان کی ابتدائی زندگی گزری تھی۔ رودِ موسیٰ کی مشہور طغیانی کی نذر ہوگئیں اور ان کی جگہ اب سٹی کالج کی عمارت بن گئی ہے۔

مدرسۂ نظامیہ کے بعد حیدرآباد کی شہرۂ آفاق درسگاہ دارالعلوم میں شرکت کی اور وہیں سے منشی فاضل کا امتحان کامیاب کرکے فارغ التحصیل ہوئے۔ اور پھر وہیں استاد بھی بن گئے۔ ان کے تحصیلِ علم کا شوق اس واقعہ سے ظاہر ہوگا کہ سنادالملک آغا شوستری کے گھر جو ان کے مکان سے آٹھ میل دور کوہ مولی کے دامن میں واقع تھا، روزانہ پیدل جاتے تھے۔ اس زمانے میں حیدرآباد مشرقی علم و فضل جتنا بڑا مرکز اور تہذیب و شائستگی کا جیسا

سرچشمہ تھا اس کا ہماری نئی نسلیں تصور بھی نہیں کر سکیں۔ سناد الملک آغا شوستری، مولوی الٰہی بخش، علامہ حبیب ابوبکر بن شہاب، علامہ نادر الدین اور مولانا سید اشرف شمسی غرض بیسیوں ایسے حضرات حیدر آباد کے گلی کوچوں میں موجود تھے۔ جن کے علم و فضل کے تذکرے کتابوں میں تو موجود ہیں مگر ہم ان سب کو بھول چکے ہیں اور موجودہ تعلیم یافتہ اصحاب تو ان کے تبحرِ علمی اور اخلاق کی پاکیزگی کا اندازہ بھی نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے صرف یہ بتا دینا کافی ہے کہ حضرت امجد کی نشوونما جس ماحول میں ہوئی تھی وہ نمائش و آرائش، دولت و ثروت اور جاہ و جلال سے کوسوں دور تھا۔ وہ نہ حیدر آباد کے پشتینی جاگیردار و منصب دار تھے اور نہ کسی خاندانِ رشد و ہدایات کے چشم و چراغ، اس طرح کی سرمایہ داری سے عاری اور آج کل کی اصطلاح میں صحیح معنوں میں ایک پرولتاری تھے۔ مزدوروں کی زندگی بسر کرتے تھے۔ چناں چہ جب تک قویٰ نے ساتھ دیا، بازار سے گوشت اور بھاجی ترکاری تک خرید کر لاتے رہے۔

دارالعلوم کی مدرسی کے زمانے میں حضرت امجد حیدر آباد کے ایک مشہور مشائخ خاندان کے چشم و چراغ حضرت حسینی علیہ الرحمۃ کی تعلیم اور اتالیقی کی خدمت پر مامور ہوئے اور مدرسے کے قریب انھیں کے مکان کے ایک کمرے میں فروکش تھے، اس لیے کہ اس سے قبل چھپادر وازے کی قیام گاہ کے ساتھ ان کے اہلِ خاندان بھی دریا برد ہو چکے تھے۔ اور خود وہ تنہا زندہ بچ گئے تھے۔ اسی سانحے نے ان کو زندگی کی ایسی منزل پر لا کھڑا کیا جہاں

سے وہ خیراتی اور خیرات علی کی بجائے احمد حسین امجد بن گئے اور وہ مجد و شرف ان کو نصیب ہوا! جو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اسی کو عطا فرماتے ہیں۔

مجد و کمال کی اس معراج پر پہنچنے کے لیے حضرت امجد کو جن منزلوں سے گزرنا پڑا ان میں علامہ نادر الدین کی دختر نیک اختر بی بی جمال النسا سے مناکحت اور فیضِ صحبت بھی شامل ہیں چناں چہ اس موضوع پر خود انھوں نے ایک دلچسپ کتاب "جمالِ امجد" لکھی ہے۔ اور اسی سے دنیا کو معلوم ہو سکا کہ امجد کو حکیم الشعرائی کے راستے پر ڈالنے والی در اصل وہی لائق و فاضل اور صاحبِ تصوّف و عرفان خاتون تھیں۔ ان ہی کے ساتھ انھوں نے سفرِ حج بھی کیا تھا۔ جس کی پُر اثر داستان انھوں نے اپنی کتاب "حجِ امجد" میں بیان کی ہے۔ مگر افسوس امجد کے دل الیاصدمہ پہنچا کہ وہ سوز و گداز کا ایک صابر و شاکر پیکر بن کر رہ گئے۔ اور اپنے قلب و دماغ کی تسلّی و تسکین کے لیے خوش بختی کے انھی راستوں میں گامزن ہو گئے جن کی طرف علامہ نادر الدین کی اس صاحبِ بصیرت دخترِ حور سیرت سے ان کی بخشیں ہوا کرتی تھیں۔ یہ وہی راستے تھے جن پر کسی نہ کسی طرح حضرت علّامہ اقبال علیہ الرّحمہ بھی گامزن ہو گئے تھے اور جنھوں نے کلامِ اقبال کو شہرتِ دوام سے سرفراز کیا تھا۔

سعدیؔ کی نظم و نثر، مولانائے روم کی مثنوی، احادیثِ نبوی اور کلامِ الٰہی وہ ماخذ ہیں جو کائنات کی دوامی اقدار سے تعلق رکھتے ہیں اور دنیا کا کوئی انقلاب ان کی قدر و قیمت کو مٹا نہیں سکتا۔ درویشی اور قلندری کی دولت میں نہ کسی پنج سالہ و دہ سالہ منصوبے کے ذریعے سے اضافہ کیا

جا سکتا ہے اور نہ اس کو صرف کرنے والا کبھی مفلس ہو سکتا ہے۔ یہ روح اور دل کی دولت ہے اور خدا کرے کہ آج کل کی دنیا کی ترقی یافتہ حکومتیں جو بڑے بڑے پروجکٹ اور کروڑوں روپے کے پلان بنا رہی ہیں کم ان کی تکمیل کے بعد تو یہ دولتِ اطمینانِ خاطر اہلِ علم کو حاصل ہو سکے۔

حضرت امجد کو ایک وقت حکومت آصفی کے سپہ سالار افسر الملک فرمایا۔ ان کی کوٹھی "راحت منزل" جو کہنگی اور شکستگی کے عالم میں اب ... آباد میں اپنی عظمتِ رفتہ کا ماتم کر رہی ہے اس وقت سامانِ عیش و عشرت کی افراط اور نت نئے اسبابِ زندگی کی دلآویزی اور بہتات کے باعث ایک عصری نمائش گاہ سے کم نہ تھی۔ جب حضرت امجد نے یہ کوٹھی دیکھی اور سرتاپا شرف و کمال امیر افسر الملک سے تبادلۂ خیال کیا تو اس رباعی میں اپنا تاثر ظاہر کیا تھا۔

دیوڑھی نہیں در نہیں کہ دربان نہیں
بلبل نہیں گل نہیں کہ بستان نہیں
ہے جمع جہان بھر کا سامان گھر میں
خاطر جمعی کا کوئی سامان نہیں

اس طرح اربابِ شعر و سخن کے لیے بھی ایک پتے کی بات لکھی ہے۔ بہت سے شاعر اور ادیب ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں۔ اور دوسرے کی عزت اور شہرت اور مقبولیت کا راز معلوم کرکے اس میدان میں اس سے بڑھنے کی صالح کوشش کرنے کی جگہ غیبت، بدگوئی، منافقت، سازش اور

طرح طرح کی برائیوں میں مبتلا ہو کر آخر کار ہم چشموں میں ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر وہ اگر حضرت امجد کی یہ رباعی سمجھنے کی کوشش کریں تو بہت سی ذہنی اور اخلاقی بیماریوں سے محفوظ رہ سکیں گے۔

ہم توڑ کے تارے آسماں سے لائے
مضمون بلند لامکاں سے لائے
ہر شعر باعتبارِ فن خوب کہا
لیکن کوئی تاثیر کہاں سے لائے

حافظ نے، "قبولِ خاطر و لطفِ سخن خداداد است" کو دندانِ تو جملہ در دہانند کی طرح ظاہر کیا تھا۔ مگر امجد نے سوچنے اور سمجھنے کی دعوت دی ہے اور یہ بھی کہہ دیا ہے کہ محض اعتباراتِ فن کی تکمیل اور چالاکی و چابک دستی اور سازشیں کافی نہیں ہیں۔ سوز و گداز و خلوص اور نیک نیتی ہی وہ اجزا ہیں جن سے بقولِ حالی شعر و ادب میں تاثیر پیدا ہو سکتی ہے۔

اس قسم کی غلط کوششوں کو امجد اور طرح سے بھی واضح کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں:

لے لے کے خدا کا نام چلّاتے ہیں
پھر بھی اثرِ دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ پڑھتے ہیں نماز
کرتے نہیں پرہیز دوا کھاتے ہیں

گویا اعتباراتِ فن کی تکمیل نماز پڑھ لینا ہے جو دوا کھانے کے برابر

ہے۔ مگر بدنیتی اور جھوٹے اقتدار و شہرت کی خاطر سازشیں ایسے لقمے ہیں اور بد پرہیزی ہیں، جو دوا کا سارا اثر زائل کر دیتے ہیں اور ادیب و شاعر کی کاوشوں کو اثر اور دوامی مقبولیت سے محروم کر دیتے ہیں۔

یوں تو حضرت امجد کی اکثر و بیشتر نثر و نظم قرآن و حدیث کی شرح ہے مگر بعض جگہ ان کی شرح اس خوبی اور ندرت کے ساتھ اس کی اصل وضاحت کرتی ہے کہ وہ مشہور فارسی مقولہ یاد آتا ہے:

شاعری جزویست از پیغمبری

قرآن شریف میں ایک جگہ درج ہے کہ ہم نے اپنی امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے آگے پیش کی۔ اس کو اٹھانے سے انھوں نے انکار کیا مگر انسان نے اٹھا لیا۔ تحقیق کہ وہ جاہل تھا اور اپنے آپ پر اس نے ظلم کیا۔

اس خیال کو حضرت امجد نے اپنی ایک رباعی میں اس طرح آگے بڑھایا ہے:

اس سینے میں کائنات رکھ لی میں نے
کیا ذکرِ صفات، ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی
سب کچھ سہی، تیری بات رکھ لی میں نے

سچ تو یہ ہے کہ جیسا میں نے ان کی ڈائمنڈ جوبلی کے موقعہ پر کہا تھا حضرت امجد کے کلام میں انسانی فطرت کی بوقلمونیاں، جبر و اقتدار کی چیرہ دستیاں اور حقائق و معارف کی موشگافیاں اس لطافت سے جھلکتی رہتی ہیں کہ پڑھنے

والا زندگی سے گریز کرنے کی بجائے ایک ایسی اونچی سطح پر پہنچ کر اس سے
نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہو جاتا ہے کہ جس کے بعد زندگی کے نشیب و فراز ہی
باقی نہیں رہتے اور پھر خوبی یہ ہے کہ ان کے کلام کے مطالعے سے ایک
گونہ خود اعتمادی تو پیدا ہوتی ہے مگر وہ جارحانہ تیور نہیں ابھرنے پاتے
جن کو بعض جدید شعرا کا کلام ابھارتا ہے۔

حضرت امجد کے کلام سے نہ صرف اردو شاعری فارسی کی ہم پلہ بن
گئی بلکہ حیدر آباد کی عزت و آبرو میں ایک ایسا اضافہ ہوا جس پر یہاں کے
رہنے بسنے والے ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے۔ گذشتہ دو صدیوں میں وہی ایک
ایسے منفرد شاعر دکن میں پیدا ہوئے تھے جن کا احترام پوری اردو دنیا
میں کیا گیا اور جن کی ہندوستان گیر شہرت ہمارے لیے سرمایۂ افتخار
ثابت ہوئی۔